شمارہ ۵-۶ مئی، جون ۱۹۹۷ء جلد ۸۱

اس شمارے میں

پاکستان کی پچاسویں سالگرہ

اسلامی سربراہی کونسل کا خصوصی اجلاس

وزیر اعظم بوسنیا کی تقریر میں ۲۱ ویں صدی عیسوی کے لئے اسلام کا پیغام

انگریزی سے ترجمہ: ظہور الرحمٰن، راولپنڈی

بھائیو اور دوستو!

اسلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ

جناب صدر مجھے اجازت دیں کہ میں بوسنیا ہرزگووینا کے صدر محترم علیجاہ عزت بیگووچ کی طرف سے مبارکبادی کے پیغام اور اسلام علیکم آپ لوگوں تک پہنچاؤں۔ ان کی بے حد خواہش تھی کہ وہ آج کے اس خصوصی اجلاس میں شرکت کرتے لیکن ان کی دیگر اہم فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے انہیں کسی اور جگہ جانا ضروری ہو گیا تھا۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ان تمام ممالک کے حضرات کا ممنون احسان ہوں جو مسلسل بوسنیا ہرزگووینا کے لوگوں کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ آج کے دن محترم صدر مجلس اور اس مبارک موقع پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور یاد دلاتا ہوں کہ ۱۹۹۲ء میں بطور وزیر اعظم آپ نے بوسنیا کی مدد کا آغاز کیا تھا اور پھر بعد کی حکومتوں نے اس کو جاری رکھا۔ بوسنیا ہرزگووینا کے لوگ اس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ ہم آج ۲۱ ویں صدی کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ۲۱ ویں صدی کیسی ہو گی۔ لیکن ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ گذشتہ صدی کس طرح گزری۔ مختصراً یہ کہ لوگوں نے اپنے ہی ہم وطن دس لاکھ ۷۰ ہزار لوگوں کو ہلاک کیا۔ اندازہ لگائیں کہ دس لاکھ ۷۰ ہزار لوگوں کو گذشتہ صدی میں ہلاک کیا گیا! یہ ہلاکت صرف اتنی ہی ہوئی کیونکہ ابھی یہاں ٹیکنالوجی اتنی ترقی یافتہ نہ تھی۔ اس لئے ہلاک کرنے کی صلاحیت یا ہمارے اخلاقیات کا دائرہ عمل بدقسمتی سے ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے محدود رہا اور معاملہ اس کے الٹ نہ ہوا۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانی رویوں میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ تو ہم اس آنے والی نئی صدی سے کیا توقعات رکھ سکتے ہیں؟ شاید مزید ۱۰ کھرب انسانوں کی ہلاکت! اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں اسلام کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں چند باتیں اور تجاویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے میں یہ کہوں گا کہ پہلی عالمی جنگ میں اسلام اور مسلمانوں کے علاوہ دیگر معصوم قوموں کا کچھ بھی اس میں حصہ نہ تھا اور اسی طرح دوسری عالمی جنگ میں بھی ہمارا کوئی کردار نہ تھا جن کے دوران ۲ کروڑ لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ اسلام کا فاشزم (فسطائیت) اور اشتراکیت سے بھی کوئی تعلق نہیں جس کی جھوٹی اجتماعیت اور جور و ستم کے دیگر طور طریقوں نے مزید ۸ کروڑ لوگوں کو ہلاکت میں دھکیلا۔ مزید یہ کہ اسلام اور مسلمان ترقی یافتہ دنیا کی دوسری طرف ہیں جنہوں نے قدرتی وسائل کا نہ غلط استعمال کیا اور نہ ہی اس کے ذریعہ لوگوں کا استحصال کیا۔ اس لئے اسلام اور مسلمان ۲۱ ویں صدی میں ایک طرح سے یوں داخل ہوں گے کہ ان کا کردار بے داغ ہو گا۔ اسی طرح کئی اور باتوں کا بھی اس ضمن میں ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم جمہوریت کی بات کرتے ہیں کہ اس میں اختلاف رائے کا احترام کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس قرآن مجید کا شوریٰ کا تصور ہے۔ اگر ہم باہم گفت و شنید کی ضرورت کی بات کرتے ہیں اور یہ کہ اس طریق پر ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طریق پر

سمجھا جا سکتا ہے تو اس بارے میں قرآن مجید کا شاندار پیغام یہ ہے:

"اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو" (الحجرات ۴۹:۱۳)۔

اگر لوگوں کے باہم تعلقات' طرز زندگی اور ماحول کے اثرات کی بات کی جاتی ہے تو ہمیں پھر قرآن مجید کی طرف (رہنمائی کے لئے) دیکھنا ہو گا جہاں وہ اس کرہ ارض کو انسانوں کے لئے غیر محفوظ بنانے کے خلاف سخت تنبیہہ کرتا ہے۔ اگر ہم انسانوں کی طرح جانوروں (کی دیکھ بھال یا ان کی حفاظت) کی بات کرتے ہیں تو اس بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ملاحظہ فرمائیں۔

"اور زمین میں کوئی جاندار نہیں اور نہ کوئی پرند جو اپنے دو پروں پر اڑتا ہے مگر وہ بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔ پھر وہ اپنے رب کی طرف اکٹھے کئے جائیں گے" (الانعام ۶:۳۵)۔

اگر ہم امن کی بات کرتے ہیں تو اس کا پیغام تو اسلام کے نام میں ہی پنہاں ہے۔ ان مضبوط اصولوں کو لے کر اسلام اور مسلمان ۲۱ ویں صدی میں داخل ہو سکتے ہیں اور ایک بہتر بلکہ نئی دنیا کی تعمیر کے لئے موثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ایک اور اہم بات جس کی بہت ضرورت ہے اور جس کی ۲۱ ویں صدی میں بے حد ضرورت ہو گی وہ ہے تحمل اور رواداری۔ اس دور میں جبکہ آمدورفت کے انتہائی ترقی یافتہ ذرائع نے مختلف تہذیب و تمدن کے لوگوں کو ایک دوسرے کے بالکل قریب کر دیا ہے بلکہ وہ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر مختلف خیالات کے لوگ جو ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں اور ایک دوسرے کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتے انہیں ایک دوسرے سے زیادہ ملنا چاہئے اور ایک دوسرے سے مل کر کام کرنا چاہئے۔ اس ملاپ اور رابطہ میں تحمل اور رواداری کا ہونا بے حد ضروری ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہ سکیں اور ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں۔ اسلام اس بارے میں بہت اچھی مثال رکھتا ہے صرف الفاظ میں نہیں بلکہ عملی رنگ میں۔ اسلام کی تاریخ بنیادی طور پر تحمل اور رواداری کی تاریخ ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے ملک بوسنیا ہرزگووینا کا ذکر کروں گا۔ سخت مشکل حالات کے باوجود ہم نے بوسنیا ہرزگووینا میں انسانیت کو زیادہ سے زیادہ فاتح رکھنے کی کوشش کی۔ مساجد کو برباد کیا گیا لیکن جہاں کہیں ہمارا قبضہ تھا عیسائی گرجے اور یہودیوں کے معبد خانے بالکل محفوظ رہے۔ یہ خون اور انتقام کے مقابلہ میں ایمان اور رواداری کی فتح کے خاموش یادگاری ستون ہیں۔ اور یہ ہے بوسنیا ہرزگووینا۔ موجودہ اسلام کی تاریخ میں یہ ایک واحد اور شاندار مثال ہے جو مسلمانوں کو ۲۱ ویں صدی میں لے جانے کے قابل بناتی ہے۔ اس نئی صدی میں رواداری کی بے حد ضرورت ہو گی اور یہ واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ آنے والی صدی وہ دور ہے جس میں انسانیت اور جدید اثرات کے حامل ایسے نظریہ حیات کی ضرورت ہو گی جو انسانی تکریم' رواداری' صبر و تحمل اور متوازن فکر اور طرز زندگی کا علمبردار ہو۔

لیکن ایک بات جس کا ہونا مسلمانوں کے لئے بے حد ضروری ہے اور جس کا ہم سب کو بخوبی علم بھی ہے .... وہ ہے تعلیم۔ ہمیں تعلیم کی بے حد ضرورت ہے۔ مسلمان لڑکیوں کو تعلیم کے لئے درسگاہوں میں ضرور جانا چاہئے۔ یہ ایک انتہائی افسوسناک اور تاریخی لحاظ سے گمراہ کن راستہ ہو گا اگر غزالی' ابن سینا' ابن رشد' ابن خلدون' عمر خیام اور اقبال کی روحانی بیٹیاں علم سے بے بہرہ رہ جائیں جیساکہ ہم میں سے بعض کا خیال ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس سلسلہ میں قرآن مجید کا یہ بڑا واضح پیغام ہے۔

"اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا۔ انسان کو ایک لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب سب سے بڑھ کر بزرگی والا ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔ انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا" (العلق ۹۶:۱ تا ۵)۔

صدق اللہ العظیم

و علیکم السلام و رحمتہ اللہ و برکاتہ

انگریزی سے ترجمہ

کاوش: اطہر رسول، متعلم، ایم اے جرنلزم

اسلام کا فلسفہ اخلاق-۱

حضرت مولانا محمد علی، مفسر قرآن انگریزی و اردو

خدمت خلق

آنحضرتؐ کی جانب ابتدائی الہامات میں جتنا زور اللہ تعالیٰ کی عبادت پر دیا گیا ہے اتنا ہی زور خدمت خلق پر دیا گیا ہے بلکہ موخر الذکر پر اول الذکر سے زیادہ زور تھا۔ درحقیقت، اللہ تعالیٰ کے حضور عبادت بے معنی تھی اگر اس کے ساتھ خدمت خلق شامل نہ ہوتی۔ پھر یہ سب کچھ محض دکھاوا بلکہ قابل مذمت عمل ہوتا۔ اسی لئے ابتدائی چند سورتوں میں اس موضوع پر بہت زور دیا گیا ہے: "کیا تو نے اس شخص کی حالت پر غور کیا جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ پس ان نمازیوں کے لئے تباہی ہے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ جو دکھاوا کرتے ہیں اور خیرات کو روکتے ہیں" (۱۰۷:۱-۷)۔ لہٰذا اس لحاظ سے اس سورت میں نماز کی کوئی قدر باقی نہیں رہ جاتی اگر یہ ہمیں خدمت خلق کی راہ نہ دکھاتی۔ ان دونوں باتوں یعنی خدا کی عبادت اور خدمت خلق میں سے موخر الذکر نسبتاً زیادہ کٹھن عمل تھا۔ یہ بہت صبر آزما مرحلہ تھا: "اور کہا (ہم نے) اسے (انسان کو) دونوں اونچے رستے دکھا دیئے؟ سو وہ اونچی گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا اور تجھے کیا خبر کہ اونچی گھاٹی کیا ہے۔ کسی گردن کا آزاد کرنا، یا بھوک کے دن میں کھانا کھلانا۔ قریبی یتیم کو یا مٹی میں ملے ہو مسکین کو" (۹۰:۱۰-۱۶)۔ یتیموں اور محتاجوں کی صرف مدد کرنا کافی نہ تھا بلکہ ان کی عزت کرنے کا بھی حکم ملا: "ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم کی خاطرداری نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دلاتے اور میراث سب کچھ سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بے حد پیار کرتے ہو" (۸۹:۱۷-۲۰)۔ ایک اور مقام پر قرآن مجید میں بیان ہوتا ہے: "بڑا نیک وہ ہے جو ایمان لائے اللہ پر .... اور اس کی محبت کے لئے قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور غلام آزاد کرنے میں مال دے" (۲:۱۷۷)۔ قرآن مجید اس نکتہ پر زور دیتا ہے کہ انسان کو دولت جمع کرنے کے لئے نہیں دی گئی تھی بلکہ حقیقتاً ضرورت مند، امراء کی دولت پر حق رکھتے ہیں۔ "اور ان کے مالوں میں سوالی اور نہ مانگنے والے محتاج کا حق تھا" (۵۱:۱۹)۔ دیگر الہامات میں ان دولت مندوں کو تباہی کی وعید سنائی گئی ہے جو کہ غرباء کی مدد نہیں کرتے (مثال کے طور پر ۶۸:۱۷-۲۷)۔

آنحضرتؐ اپنی ابتدائی زندگی سے ہی کمزور اور محروم لوگوں کی بھلائی کے پرجوش حامی تھے۔ جب قریش مکہ، وفد در وفد آپؐ کے چچا حضرت ابو طالبؓ کے پاس انہیں اس بات کے لئے راضی کرنے گئے کہ وہ آنحضرتؐ کو ان کے حوالے کر دیں تاکہ وہ انہیں جان سے مار دیں (نعوذ باللہ)۔ تو اس موقع پر حضرت ابو طالبؓ نے آپؐ کی تعریف میں جن یادگار الفاظ میں گن گائے وہ ہم تک ان کی ایک نظم کی صورت میں پہنچے ہیں۔ انہوں نے کہا: "کیا میں اس شخص کو تمہارے حوالے کر دوں جو کہ یتیموں کی پناہ گاہ اور بیواؤں کا نگہبان ہے۔"

اور جب پہلی وحی اترنے پر آپؐ اس خوف سے کانپ رہے تھے کہ مبادا آپؐ بنی نوع انسان کی اصلاح کے عظیم بوجھ کو اٹھا نہ سکیں تو آپؐ کی زوجہ محترمہؓ نے ان الفاظ میں دل جوئی کی: "..... اللہ آپؐ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپؐ رشتوں کے تعلق کو مضبوط بناتے ہیں اور غریبوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں اور محروم لوگوں کے لئے حقیقتاً کوشاں رہتے ہیں اور مہمانوں کی عزت افزائی کرتے ہیں اور شدید

مفلسی کے شکار لوگوں کی مدد کرتے ہیں" (بخاری ۱:۱۱)۔

آنحضرتؐ نے اپنے سننے والوں پر بارہا زور دیا کہ خدمت خلق' زندگی کا ایک عظیم نصب العین ہے۔ آپؐ نے ایک مرتبہ مسلمانوں کو ایک جسم سے تشبیہ دی جس کا ایک حصہ بیمار ہو تو پورا جسم بیمار ہو جاتا ہے (بخاری ۷۸:۲۷)۔ آپؐ نے ایک ایسے شخص کو جو کہ خلوص نیت سے بیواؤں اور محتاجوں کے امور کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس شخص کے برابر قرار دیا جو کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہے۔ یا اس شخص سے جو رات کو نماز کے قیام میں رہتا اور دن کے وقت روزے رکھتا ہے (بخاری ۶۹:۱)۔ آپؐ نے اس شخص کو جنت میں اپنے قرب کی خوشخبری دی جو کہ ایک یتیم کی پرورش کرتا ہے (بخاری ۷۸:۲۴)۔ آپؐ نے صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا: "وہ ہم میں سے نہیں ہے جو چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا سلوک نہیں کرتا اور بڑوں کی عزت نہیں کرتا" (مشکوۃ ۲۴:۱۵)۔ آپؐ جانوروں کے لئے بھی نرم دل رکھتے تھے۔ آپؐ نے جانوروں کے ساتھ ظالمانہ سلوک سے خصوصی طور پر منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک بھی جزا کا حامل ہوتا ہے (مشکوۃ ۶:۶)۔

خیرات

آنحضرتؐ کا خیرات دینا' ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا: "آپؐ سب سے زیادہ خیرات کرنے والے انسانوں میں سے تھے"۔ یہ وہ حال ہے جو کہ صحابہ کرامؓ نے اگلی نسلوں کو آپؐ کے بارے میں بتایا۔ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے علاوہ انسان کو خیرات دینے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس نکتہ پر خاص زور دیا گیا ہے کہ خیرات کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی محبت ہونی چاہئے۔ ابتدائی الہامات میں سے ایک میں یہ ارشاد ہوا: "اور اس کی محبت کی وجہ سے مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لئے کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ" (۷۶:۸-۹)۔ اور بعد کے ایک الہام کے مطابق "..... بڑا نیک وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت کے لئے قریبیوں' اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوالیوں کو اور غلام آزاد کرنے میں مال دے ....." (۲:۱۷۷)۔ خیرات کا یہ عمل' مقصد میں اخلاص کی وجہ سے دولت میں برکت کا باعث بنتا ہے۔ "..... اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو اس کے ساتھ اللہ کی رضا چاہتے ہو تو یہی بڑھا لینے والے ہیں" (۳۰:۳۹)۔ خیرات کی وجہ سے دولت میں جو اضافہ ہوتا ہے وہ اس بیج کی مانند ہے جو کئی گناہ زیادہ بڑھتا ہے۔ "ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک دانہ کی مانند ہے جو سات بالیں اگائے۔ ہر ایک بال میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے' کئی گناہ کر کے دیتا ہے ....." (۲:۲۶۱)۔

خیرات کا عمل ریاکاری اور تمام تنگدلانہ مقاصد سے پاک ہونا چاہئے جیسے ذاتی مفادات' حتیٰ کہ خیرات وصول کرنے والے کو کسی احسان تلے دبانا بھی اس میں شامل ہے۔ "وہ لوگ جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے پیچھے جو خرچ کیا نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دکھ دیتے ہیں ان کے لئے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور انہیں کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ نیک بات کہنا اور معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے' جس کے پیچھے دکھ پہنچایا جائے اور اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ستا کر باطل نہ کرو۔ اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتا ....." (۲:۲۶۲-۲۶۴)۔

خیرات اچھی چیزوں میں سے دینی چاہئے۔ ایسی چیزوں سے جو انسان خود اپنے لئے پسند کرتا ہے: "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' ان اچھی چیزوں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو اور اس سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے اور ردی چیز (دینے کا) قصد نہ کرو۔ اس میں سے تم خرچ کرو گے۔ حالانکہ تم خود اس کو لینے والے نہیں ....." (۲:۲۶۷)۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے: "تم راستبازی کو ہرگز حاصل نہ

کرو گے۔ یہاں تک کہ اس سے خرچ کرو جس سے تم محبت کرتے ہو ....." (۹۱:۳)۔ خیرات' قومی مفاد میں اعلانیہ طور پر بھی دی جا سکتی ہے جبکہ غرباء کی امداد کے لئے مخفی طور پر دی جا سکتی ہے: "اگر تم خیرات کھلے طور[۱] پر دو تو کیا ہی اچھی بات ہے اور اگر تم اسے چھپاؤ اور محتاجوں کو دو تو وہ تمہارے لئے اچھا ہے ...." (۲۷۱:۲)۔ مسلمانوں کی خیرات صرف ان کے ہم مذہبوں تک محدود نہیں ہے (۲۷۲:۲)۔ ان افراد کو خیرات خصوصی طور پر دینی چاہئے جو کہ گداگری ترک کر چکے ہوں (۲۷۳:۲)۔ سب سے بڑھ کر اسلام چاہتا ہے کہ اس کے پیروکار دولت رکھنے کے بارے میں مکمل طور پر نئی ذہنیت اپنائیں جس میں وہ دولت کی محبت کو ترک کر دیں۔ اس سلسلے میں غرباء کو امراء کی دولت میں مناسب حصے کا حق حاصل ہے۔ ان سچے مسلمانوں کی آخرت میں موجودگی کے لئے ان کی اس زندگی میں خصوصیات اس طرح بیان کی گئی ہیں: "تھوڑا سا جو وہ رات کو سوتے تھے اور صبح کے وقتوں میں وہ استغفار کرتے تھے اور ان کے مالوں میں سوالی اور نہ مانگنے والے محتاج کا حق تھا" (۵۱:۱۷-۱۹)۔ ایک اور مقام پر صحیح مسلمان کے کردار کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: "جو اپنی نماز پر ہمیشہ قائم ہیں اور وہ جن کے مالوں میں ایک مقرر حق ہے سوال کرنے والے اور محروم کے لئے" (۷۰:۲۳-۲۵)۔

پس عبادت اور خیرات نیک ہونے کی دو ضروری شرائط تھیں۔ جس واجب الادا حق کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ زکوٰۃ سے مختلف ہے جو کہ فرض ہے اور ایک مخصوص شرح سے قابل ادائیگی ہے اور مملکت کی جانب سے لاگو ہونے کی وجہ سے ٹیکس کی ہی ایک قسم کا درجہ رکھتی ہے۔ آنحضرتؐ نے خود ہی اس بات کو واضح کیا ہے: "(قابل حیثیت) کے مال میں سے زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ واجب الادا ہے" (بخاری ۳۱:۲۴)۔ دولت جو انسان کماتا ہے' صرف اسی کی نہیں ہے۔ اس کمائی کا ایک حصہ خیرات میں دیا جانا چاہئے' چاہے انسان خود کسی قدر سخت حالات میں بسر کر رہا ہو۔ آپؐ کا یہ واضح حکم ہے: "خیرات ہر مسلمان پر فرض ہے" (بخاری ۷۲:۵۶)۔ اس پر ایک صحابیؓ نے عرض کی کہ "اس شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے؟" آپؐ نے فرمایا "اسے اپنے ہاتھ سے محنت کرنی چاہئے اور منافع کما کر اسے خیرات میں دینا چاہئے۔" اس پر دوبارہ عرض کی گئی "اگر پھر بھی اس کے پاس کچھ نہ بچے' تب کیا حکم ہے؟" جواب یہ تھا کہ "اسے مفلسوں کی مدد کرنی چاہئے جو کہ ضرورت مند ہوں۔" اس پر ایک مرتبہ پھر عرض کی گئی "اگر وہ ایسا کرنے کے قابل بھی نہ ہو تو پھر؟" آپؐ نے فرمایا "اسے نیک اعمال کرنے چاہئیں اور برے اعمال سے بچنا چاہئے۔ یہ اس کی جانب سے خیرات تصور ہو گی" (بخاری ۲:۴۶)۔

آنحضرتؐ کے نزدیک خیرات کا تصور بہت وسیع تھا۔ "انگلی کی ہر ہڈی پر ہر روز خیرات فرض ہے۔ اگر ایک شخص دوسرے کو اس کے جانور پر سوار ہونے میں یا جانوروں کی پشت پر اس کا سامان رکھنے میں مدد دیتا ہے تو اس کی طرف سے یہ خیرات ہے اور ایک اچھا قول اور ہر وہ قدم جو انسان کو نماز کی طرف لے جائے' اس کی خیرات ہے" (مشکوٰۃ ۶:۶)۔ "رستے میں تکلیف پہنچانے والی کسی چیز کو ہٹا دینا بھی خیرات ہے" (بخاری ۲:۴۶)۔ حتیٰ کہ دوسرے شخص سے خوش اخلاقی سے ملنا بھی خیرات میں شمار ہوتا ہے۔ "ہر نیک عمل خیرات ہے اور یہ ایک نیک عمل ہے کہ جب بھی تو اپنے بھائی سے ملے تو خوش اخلاقی کے ساتھ ملے اور اپنی بالٹی سے اپنے بھائی کے برتن میں پانی ڈالے" (مشکوٰۃ ۶:۶)۔

آنحضرتؐ انسانوں کو یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ خیرات دینا انسان کے لئے ضروری ہے۔ آپؐ کے قائم کردہ مذہبی نظام کی دو نمایاں خصوصیات یہی ہیں کہ انسانوں کو عبادت گذار اور خدمت خلق کے لئے خیرات گذار بنا دیا جائے۔

---

[۱] خیرات کھلے طور پر دینا "لوگوں کو دکھانے کے لئے" کے عمل سے بالکل مختلف ہے (۲۶۴:۲)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رقم کو عوام کی بھلائی کے کاموں اور ملکی فلاح و ترقی کے کاموں میں استعمال کیا جائے اور غرباء کے لئے ایسے منظم طریقے کے ساتھ معاملات طے کئے جائیں۔ جن کے بغیر ملکی ترقی ناممکن ہوتی ہے۔

انگریزی سے ترجمہ

بے نظیر روحانی انوار کا الٰہی سرچشمہ ۔۶

آنحضرت صلعم کی نبوت کی تاریخی اہمیت

شیخ غلام ربانی' بی اے' ایل ایل بی

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دین اسلام تاریخ کی کھلی روشنی میں طلوع ہوا اور کسی بھی تاریخی شخصیت کی زندگی' تعلیم اور کام کی اس طرح کی دقیق اور ہمہ پہلو احتساب اور جانچ نہیں کی گئی جس قدر کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کی گئی ہے۔

ارنسٹ رینان نے اپنے مقالہ میں جو اس نے "محمد اور اسلام کا آغاز" کے موضوع پر تحریر کیا تھا' لکھا ہے کہ دوسرے ادیان کے جو چیستان کے گہواروں میں نہاں ہیں کہ مقابلے میں اسلام تاریخ کی پوری روشنی میں پیدا ہوا ہے اور اس کے بانی کی زندگی ہمیں اس سے کہیں بہتر طور پر معلوم ہے جیسے کسی سولہویں صدی عیسوی کے مصلح کی ہو سکتی ہے۔

(Bernard Lewis, "The Arabs in History," 2nd Edition, published by Harper & Brothers, New York, p.36.)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے رسولوں میں سے آخری نبی تھے جو کمال کی انتہائی بلندی پر تھے اور اقوام عالم کی طرف بھیجے گئے۔ ان کے ذریعے انسانوں کو بشارت بھی دی گئی اور غافلوں کو تنبیہہ بھی کی گئی اور گمراہوں کو خدا کے راستے کی طرف بھی بلایا گیا وہ گویا ایک روشنی تھے جو راہ راست کی نشاندہی کر رہی تھی: "بے شک تمہارے لئے رسول اللہؐ میں ایک اعلیٰ اور قابل تقلید نمونہ ہر اس کے لئے ہے جو خدا تعالیٰ سے امید رکھتا ہے اور یوم آخر پر ایمان لاتا ہو اور اللہ کا ذکر کرتا رہا کرو" (۳۳:۲۱)۔

"اے نبی ہم نے تجھے یقیناً گواہ بنا کر بھیجا ہے تو خوشخبری کا حامل ہے اور خطرات سے ڈرانے والا بھی اور تو خدا کے فضل و حکم سے داعی الی اللہ بھی ہے اور ایک روشن چراغ جو نور افشاں ہے" (۳۳:۴۵'۴۶)۔

کوئی بھی انسانوں کے لئے مکمل نمونہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی زندگی کا ہر پہلو کلی طور پر عیاں نہ ہو۔ ایک خیالی اور دیو مالائی کردار کبھی نمونہ نہیں بن سکتا۔ انسانیت کے لئے ایک راہنما بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی زندگی کی ہر تفصیل یعنی اس کی شخصیت کا ہر قول و عمل مستند اور قابل اعتماد ہو اور جانچا جا سکے۔ محمد رسول اللہؐ کی زندگی' تعلیم اور اعمال تاریخی تحقیق کی اس جانچ پر نہایت قابل تعریف حد تک پورے اترتے ہیں۔

وہ مسیحی تقویم کے مطابق ۵۷۰ عیسوی میں پیدا ہوئے اور ۶۳۲ عیسوی میں انتقال فرما گئے۔ تاریخ کی روشنی میں ان کی زندگی کا ہر دن ہر مہینہ اور ہر سال صاف نظر آتا ہے۔ وہ اپنے والد کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے۔ اس وقت سے لے کر جب وہ پیدا ہوئے' جوان ہوئے' نبوت عطا ہوئی' پھر سارا عرب ان کے زیر نگیں آیا اور آخر کار وہ فوت ہوئے' سارے واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ان کی پاک زندگی کا کوئی پہلو اور کوئی حصہ بھی ایسا نہیں جو تاریخ کی جانچنے والی آنکھ سے چھپا ہوا رہ گیا ہو۔"

"اب پوری دیانت داری سے کہا جا سکتا ہے کہ جتنے بھی معروف (Law Givers) مقنن اور فاتح (Conquerors) ہیں ایک نام بھی ایسا نہیں لیا جا سکتا جس کی زندگی اتنی مستند' معتبر اور اتنی تفصیل سے لکھی گئی ہو' جتنی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی"

(John Davenport : An Apology for Mohammad & Koran, Ed. by M. Amin, Lahore, 1944, p.1.)

احادیث رسولؐ اور ان کی ثقاہت

محمد رسول اللہؐ نے اپنا مشن ایک معلم اخلاق اور پاکیزگی بیان کیا ہے: "میں صرف ایک معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاقیات کی تکمیل کر

دوں"۔ اپنے اس مقدس اور الہیاتی مشن کی اہمیت سے آگاہی ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنے ماننے والوں کو واضح ہدایات دیں کہ وہ جو کچھ بھی میری اخلاقی یا قومی زندگی میں دیکھتے ہیں یا سنتے ہیں اس سے دوسروں کو بھی آگاہ کر دیں۔ اس لئے ان کی ازواج مطہراتؓ کو اجازت تھی کہ وہ انؐ کی زندگی کے بارے میں جسے وہ دن یا رات کو بھی دیکھتیں دوسروں کو بھی بتا سکتی تھیں۔ انؐ کے ستر پیروکار مسجد سے ملحق ان کے گھر کے پاس رہتے تھے تاکہ وہ انؐ کے اقوال و اعمال کو ریکارڈ کر سکیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امن ہو یا جنگ، خوشحالی یا ہو فقر، شادی شدہ زندگی ہو یا غیر شادی زندگی، تعلق باللہ سماجی روابط فتح و شکست، غصہ اور تحمل، تنہائی یا مجلس ہو غرضیکہ زندگی کے ہر حال میں جو بھی نمونہ ہمیں درکار ہوا فراہم کیا ہے۔ عبدالحمید صدیقی صاحب اپنی انگریزی کتاب "اسلام میں نبوت" میں اس بارے میں تحریر فرماتے ہیں: "انسان انؐ کی جرات پر حیران رہ جاتا ہے کہ کس طرح انہوںؐ نے عوام الناس کے سامنے نہ صرف اپنی پبلک زندگی کھول کر رکھ دی بلکہ اپنی پرائیویٹ زندگی کو بھی نہیں چھپایا۔ کون انسان اس صبر آزما مصیبت اور جانچ کا سامنا کر سکتا ہے کہ رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے چوبیس گھنٹے ساری عمر ایک ایسی چیز کی طرح پیش کر دے کہ لوگ اسے دیکھتے رہیں اور پرکھتے رہیں۔ وہ صرف ایک ایسا انسان ہی ہو سکتا ہے جو ایک غیر معمولی کردار اور دیانت کا مالک ہو اور جو ایک بلند درجہ کے ضبط نفس، خود اعتمادی اور خود ارادیت کا حامل ہو۔ یہ صرف محمد رسول اللہؐ ہی تھے جو اس امتحان سے دوچار ہوئے اور انہوںؐ نے نہ صرف لوگوں کو اس کی اجازت دی کہ وہ حضورؐ کے نہاں خانوں میں جھانک سکتے ہیں بلکہ جو انہوں نے دیکھا ہو اس کو دوسروں کے سامنے بیان بھی کر سکتے ہیں اور یہ پہلو خدا تعالیٰ کی طرف سے درخشاں کر کے دکھلائے گئے" (ص ص ۵۲، ۵۴)۔ جس طرح حضورؐ کی پبلک زندگی اور مشن کو دکھایا گیا اس نہج سے نبیؐ کی احادیث اور سنت مسلمانوں کے مذہب اور ایمان کا ایک ناگزیر حصہ ہیں۔ اس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے بانیان مذاہب سے ممیّز نظر آتے ہیں کہ انؐ کی زندگی کا ہر واقعہ اور ہر قصہ اور ہر پہلو آنے والی نسلوں کے لئے لکھا ہوا موجود ہے۔ وہ قرآن کی بیان کردہ تمام اخلاقی خوبیوں کے مجسم نمونہ تھے۔ ان کی باعصمت اور باوقار زندگی کا ہر لمحہ قرآن پاک کی تفسیر اور وضاحت ہے۔ آج کل بعض نہیں اکثر جدیدیت کے شیدائی اور ترقی پسند مسلمان حدیث کے بارے میں تخفیف کے رنگ میں کلام کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم یہ بھی سنتے ہیں کہ ہمیں قرآن کی طرف پلٹ جائیں۔ آؤ اور احادیث اور سنت پر آنکھ بند کر کے عمل نہ کریں۔ ایسے نعرے اصل میں اسلام سے لاعلمی اور جہالت کے غماز ہیں۔ یہ ایک ثابت شدہ سچائی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات چاہے وہ زبانی طور پر ہدایات کی شکل میں ہوں یا عملی طور پر سنت کی شکل میں ہوں، قرآن پاک ہی کی وضاحت کرتی ہیں۔ کوئی ایسی دعوت جو حدیث اور سنت کی بے توقیری کی طرف بلاتی ہو یا منتج ہو، انتہائی مجوب اور ذہنی دھوکہ دہی ہے۔

حدیث شریف کا ادب جس میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اقوال اور اعمال کا اندراج ہے دنیا کا ایک یکتا اور عدیم النظیر اچھوتا ادب ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے اقوال اور اعمال کی نسبت صحابہ کرام کو کہا کہ ان کو آزادی ہے کہ وہ ان کے بارے میں دوسرے لوگوں کو بھی بتا سکتے ہیں۔ وہیں یہ بھی کہا کہ وہ جو کچھ کہیں سچ کہیں۔ مزید براں حضورؐ نے کہا کہ "جو کوئی میری طرف کسی ایسے قول یا عمل کی نسبت کرے گا جو اس نے نہیں دیکھا نہ سنا اور وہ ارادۃً جھوٹ بولے گا تو وہ سمجھ لے کہ اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔" اس لئے اکثر اوقات اجل صحابہؓ اور دانشور جب کوئی روایت بیان کرتے تھے تو کانپ جاتے تھے کہ کہیں وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی ایسے قول یا عمل کو منسوب تو نہیں کر رہے جو جعلی ہے مبادا وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا مورد ہو جائیں۔

۲۳ سالہ نبوت کے مشن میں (۶۱۰ء سے ۶۳۲ء) انہوں نے انؐ کے ایک ایک عمل کو دیکھا اور جانچا اور اس کو نہایت دیانتداری سے ریکارڈ کیا۔ جوں جوں انؐ کے اصحابؓ کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کے سینکڑوں اقوال ذہنوں میں محفوظ کر لئے گئے۔ کچھ کو چمڑے یا ہڈیوں پر بھی لکھا گیا۔ ان روایات کو راویوں کی کڑی جانچ اور چھان پھٹک کے بعد مرتب کیا گیا اور یہ کام امام بخاری، امام ترمذی، امام مسلم، امام ابو داؤد جیسے معتبر اور پاکیزہ محدثین یا جامع روایات نے کیا۔ اس بارے میں معروف نو مسلم مترجم قرآن محمد اسد لکھتے ہیں:

"باوجود ان تمام کوششوں کے جو احادیث کے معتبر ہونے کو چیلنج کرنے کے لئے کی گئی ہیں عہد جدید کے مشرقی اور مغربی نقاد دونوں اپنی خالصتاً متلون جذباتی تنقید میں کامیاب نہیں ہو سکے کہ اسے جدید

سائنسی تحقیق پر کس طرح جانچ سکیں۔ یہ بات ہے بھی بہت دشوار کیونکہ احادیث کے ابتدائی مرتب کرنے والے اور خاص طور پر امام بخاری اور امام مسلم نے ہر حدیث کو ممکن حد تک بہت سخت کسوٹی پر جانچا۔ وہ کسوٹی اس سے کہیں زیادہ سخت اور شدید تھی جس پر کہ عہد جدید کے مورخ کسی تاریخی دستاویز کی زمانہ حال میں جانچ کرتے ہیں" ("اسلام ایٹ دی کراس روڈ" ص ۱۲۰)۔ تاریخ نویسوں کی تخلیقات میں اکثر اوقات قاری کو ایسی باتوں کو بھی پڑھنا پڑتا ہے جو محض افواہیں ہوتی ہیں' یا گپ شپ ہوتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ افواہیں اور گپ شپ ایک مضبوط سچائی کا روپ دھار لیتی ہیں۔ مگر یہ طریق محدثین نے نہیں اپنایا تھا۔ ابتدائی محدثین نے کسی حدیث کے معتبر اور مستند ہونے کی جانچ کے لئے بے حد محتاط رویہ اختیار کیا وہ خود اپنی جگہ ایک علم ہے جس کا اصل مقصد روایت کے مفہوم اور طریق روایت کے بارے میں تحقیق تھا۔ تحقیق بھی ایسی جو معروضی اور تجزیاتی ہو۔ ہر ایک صحیح حدیث کو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا گیا اگر وہ قول تھا اور اگر وہ عمل تھا یا واقعہ تھا تو اس کو عینی شاہد تک تلاش کیا گیا۔

ہر ایک قول اور ہر ایک واقعہ اس کی ہر سطح پر تصدیق کروائی گئی جو کئی واسطوں سے روایت ہوا ہے۔ تحقیق کے اس انداز میں بہت سے راویوں کی سوانح اکٹھی ہو گئیں۔ روایات کرنے والے ان مردوں اور عورتوں کی پھر زندگیوں کو تنقید اور جانچ کی کسوٹی پر پرکھا گیا اور صرف انہی کو قبول کیا گیا جن کی طرز زندگی ان اصولوں کے مطابق نظر آئی جو محدثین نے روایت کو قبول کرنے کے لئے اختیار کرلئے تھے۔

یہ انسائیکلوپیڈیائی ذخیرہ سوانح ہائے حیات کا جس کے نتیجہ میں ہزاروں راویوں کی زندگیاں محفوظ کرلی گئی اور جو خود ایک فن کی شکل اختیار کر گیا جس کو علم اسمائے الرجال کہا گیا ہے جس میں راوی کے قابل اعتماد ہونے کا منہاج مقرر کیا گیا کہ وہ راوی کیسی زندگی جیا اس راوی کا کردار کیسا تھا جو معروضی اور تجزیاتی چھلنیوں میں چھانا گیا۔ سوانح حیات کا یہ ذخیرہ اس قدر مکمل' مستند اور مفصل ہے کہ ڈاکٹر اے سپرنگر نے باوجودیکہ اس نے حضور نبی اکرم صلعم کی زندگی کو جس حسد اور کینہ کا نشانہ بنایا ہے اسلامی تاریخی کے اس عظیم اور محیرالعقول کارنامے کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکا:

"مسلمانوں کے لٹریچر کی عظمت اس کی ادبی سوانح نگاری بھی ہے اگر مسلمانوں کے سوانح نگاروں کی تخلیقات کو اکٹھا کیا جائے تو ہم شاید نصف ملین عظیم لوگوں کی زندگی سے آگاہ ہو جائیں گے اور ایسا معلوم ہو گا کہ ان کو تاریخ کا ایک سرواں حصہ بھی ایسا نہیں جس میں کسی اہم مقام کی نمائندگی نہ ہو" ("محمد دی آئیڈیل پرافٹ" لکھنؤ ۱۹۸۱ء ص ۴۰)۔

اسماء الرجال کا سارا علم اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ رسول اکرم صلعم کی زندگی کے حالات اور ان کی تعلیمات کو محفوظ کرنے میں انتہائی احتیاط بلکہ ایمانداری اور حقیقت پسندی سے کام لیا گیا ہے۔ یہ علم حقائق تک پہنچنے اور جانچ پڑتال کے تقاضوں کو اس حد تک پورا کرتا ہے کہ اب تک کوئی نقاد صحیح طریق پر یہ ثابت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا کہ حدیث کا مجموعہ جو مستند محدثین کے معیاری اصولوں پر پرکھا گیا' ناقص اور غیر صحیح ہیں۔

مستند احادیث کے ذخیرے کے علاوہ ایک لمبی روایت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات کی بھی ہے جو عین انؐ کے دور سے ملحق ہی لکھی جانی شروع ہو گئی تھی اور اب تک لکھی جا رہی ہے۔ جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے۔ شاید ہی کوئی مہذب ملک ایسا ہو جس میں حضورؐ کی سوانح حیات پر نہ کچھ لکھا گیا ہو یہ ایک مسلسل عمل رہا ہے۔ ہر ایک نسل نے نئے سرے سے بنیادی ماخذ کا مطالعہ کیا اور روایات اور تاریخی ریکارڈ کی جانچ اور تحقیق کی اور اس نئے اور پھر معاصر ادوار کے علم کی روشنی میں اس پر لکھا ہے اور یہ کوئی مبالغہ آمیز دعویٰ نہ ہو گا کہ ہر نئی سوانح حیات پہلے سے زیادہ تجزیاتی' مفصل اور معتبر و مستند ہوتی ہے اور اس سے کہیں زیادہ معتبر ہوتی ہے جتنی پیغمبر یا مصلح یا مذہبی راہنما کی اس کے پیروؤں نے لکھی ہو گی۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق' رویوں اور زندگی کا عالی شان ریکارڈ ان کے متبعین کو ترغیب دلاتا ہے کہ وہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اس لئے کریں کہ وہ نوع انسان کے لئے ایک کامل نمونہ ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ریکارڈ کی کثرت اسلام کے دوستوں اور دشمنوں کو یکساں طور پر چکاچوند طریق پر متاثر کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اسلام کے سخت ترین نقاد ڈی ایس مارگولیتھ اپنے یہودی تعصب کے علی الرغم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوا: "محمدؐ کے سوانح نگار ایک لمبی قطار کی مانند ہیں جس کو ختم کرنا ناممکن ہے لیکن اس میں مقام پانا خود سوانح نگار کے لئے اعزاز کا باعث ہے"۔

(Mohammad. and the Rise of Islam by D.S.Margoliath, London, 1905, p.l.)

بی بی سی ٹیلی وژن پروگرام لندن

انگریزی سے ترجمہ: سمیرا اظہرالدین' فائزہ عزیز

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کون تھے؟-۱

(۱۴ اپریل ۱۹۷۷ء کو بی بی سی ٹیلیویژن لندن پر کیمبرج یونیورسٹی کے فلسفہ مذاہب کے پروفیسر ڈان کیوپٹ نے Who was Jesus (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کون تھے) کے عنوان سے پروگرام پیش کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش' وفات' زندہ جی اٹھنا اور ان کی طرف منسوب عقائد کے بارے میں اس نہایت عالمانہ اور دقیق گفتگو میں پروگرام پیش کرنے والے کے علاوہ ذیل کے ماہرین نے شرکت کی:

۱۔ مانچسٹر یونیورسٹی میں قدیم تاریخ کے پروفیسر انتھنی برلے

۲۔ سینٹ چاڈز کالج' درھم یونیورسٹی کے پرنسپل جان فینٹن۔

۳۔ یروشلم میں راک فیلر عجائب گھر کے مہتمم اعلیٰ ڈاکٹر رومانی

۴۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں عہد جدید کے ماہر پروفیسر ڈاکٹر جارج کیرڈ

۵۔ یروشلم میں عبرانی یونیورسٹی میں "عیسیٰ کی زندگی" کے مصنف ڈاکٹر ڈیوڈ فلاسر)

حضرت عیسیٰ ؑ کی کہانی آج کی سیکولر (لادینی) صدی میں بھی ایک نسل سے دوسری نسل کو بیان کی جا رہی ہے۔ تمام عظیم مذاہب کے بانیوں میں سے حضرت عیسیٰ ؑ کی شخصیت سب سے زیادہ الجھن میں ڈالے ہوئے ہے۔ کسی اور انسان کی نہ تو اس قدر پرستش کی جاتی ہے اور نہ ہی اسے اس قدر نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں ہمارے تمام تصورات ذہنوں میں متفرق خیالات پیدا کرتے ہیں لیکن ۱۹۷۷ء میں بھی حضرت عیسیٰ ؑ کے بارے میں چرچ کا تصور بنیادی طور پر وکٹورین دور کی عکاسی کرتا ہے۔ اینگلیکن چرچ کے مذہبی عقائد کے مطابق حضرت عیسیٰ ؑ ایک خدائی ہستی ہیں جو بادشاہوں کے بادشاہ اور شہنشاہوں کے شہنشاہ ہیں۔ جنت جن کا تخت ہے اور زمین ان کا پائیدان ہے۔ انتہا پسند عیسائی آپ کو جنوبی امریکہ کے انقلابی لیڈر شی گوئیوارہ کی طرح عقیدت سے سلام کرتے ہیں۔ انجیل مقدس کی تعلیمات کے مطابق آپ سپر مین یعنی مافوق الفطرت انسان ہیں۔ جبکہ روایتی عیسائیوں کے نزدیک اب بھی آپ ایک مقدس ہستی ہیں۔

حضرت عیسیٰ ؑ کون تھے؟ حضرت عیسیٰ ؑ کی موجودہ تصویر خود انسانوں کی اپنی کاوش نظر آتی ہے۔ کیا حضرت عیسیٰ ؑ تصور کی تخلیق ہیں جو تاریخی واقعات کی حد بندیوں سے آزاد ہیں۔ کیا وہ اب وہ کچھ ہیں جو ہم انہیں بنانا چاہتے ہیں اور ان کی شخصیت ہمیشہ اسی طرح ہمارے تصورات کے مطابق ڈھلتی چلی جائے گی حتیٰ کہ وہ ٹارسن کے تخلیق کردہ مصلح کی شکل اختیار کر لے گی جس نے جنسی آزادی کا علم بلند کیا تھا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ دو ہزار سال کے تصوراتی دور سے پیچھے کی طرف لوٹا جائے اور تحقیق کی جائے کہ کیا واقعی ناصرہ میں کوئی عیسیٰ ؑ رہتا بھی تھا اگر ایسا تھا تو وہ کس طرح کے تھے؟ اس پروگرام میں ہم اسی مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس تحقیق میں ہم آثار قدیمہ سے لے کر قدیم صحائف تک کی چھان بین سب کچھ کریں گے۔ اس سلسلہ میں ہم اسرائیل بھی جائیں گے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ وہاں رہتے تھے۔ ہم ذہن میں پہلے سے قائم کئے ہوئے کسی مفروضہ کے بغیر ہی آغاز کریں گے۔ میں خود بھی عہد نامہ جدید کے بارے میں ایک ماہر کا سا علم نہیں رکھتا۔ میں یہاں کیمبرج یونیورسٹی میں فلسفہ مذاہب پر تحقیق کا کام کر رہا ہوں۔ میرا کام دلائل اور ثبوت کو جانچنا ہے۔ ہم پہلے ماہرین کی رائے لیں گے اور جو

کچھ وہ بتائیں گے اس کی اسی معیار پر پرکھ کریں گے جس طرح کسی واقعہ کی تاریخی طور پر چھان بین کی جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ جس زمانے میں رہتے تھے اس کے بارے میں آج زیادہ بہتر معلومات میسر ہیں۔ ہمارے لئے یہ موقع ہے کہ ہم اپنے سے پہلے محققین سے بہتر کام کریں۔ بہرحال ہمیں ہر قیمت پر حقیقت کو جاننے کی کوشش کرنی چاہئے۔

پہلا سوال ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ کیا حضرت عیسیٰؑ کبھی تھے بھی؟ کیونکہ اس کا انکار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے ہمیں کسی قدیم زمانے کے مورخ سے پوچھنا پڑے گا۔

انتھنی برلے مانچسٹر یونیورسٹی میں قدیم تاریخ کے پروفیسر ہیں۔

بائبل کے علاوہ اس بارے میں کیا شواہد ہیں؟ اس سلسلہ میں مختلف قسم کے شواہد ملتے ہیں۔ سب سے پہلے یہودی مورخ جوسیفس ہیں جنہوں نے ۸۰ء اور ۹۰ء میں تاریخ مرتب کی ہے۔ اس کے ہاں ہمیں حضرت عیسیٰؑ کا دو دفعہ ذکر ملتا ہے۔ یہ تھوڑے سے مشکوک ہیں اور بلاشبہ عیسائیوں نے اس میں رد و بدل کیا ہے۔ پھر ذرا بعد میں دوسری صدی کے آغاز میں دو ہم عصر مورخ Tacitus اور Pliney کی تحریرات میں بھی ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ Pliney ایک ادیب ہونے کے علاوہ بحر اسود کے رومن صوبے ساؤتھ کوسٹ کا گورنر بھی تھا۔ اس نے شہنشاہ کو خط تحریر کیا کہ وہ عیسائیوں کے بارے میں کیا کرے؟ کیونکہ اسے عیسائیوں کو سزا دینے کے بارے میں مروجہ قانونی طریق کار کا علم نہ تھا۔ اس نے بادشاہ کو اس خط میں یہ بھی بتایا کہ وہ عیسائیوں کے بارے میں کیا کر رہا ہے اور اسے ان کے بارے میں کیا معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ اس نے مزید بتایا کہ ''عیسائی صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کی حمد گاتے ہیں جیسے کہ وہ کوئی خدا ہوں۔''

اس واقعہ کی تاریخ ۱۱۰ اور ۱۱۲ عیسوی ہے لیکن یہ کوئی اتنی واضح نہیں ہے۔ اس سے زیادہ معتبر ذکر مورخ Tacitus کرتا ہے جو کہ Pliney کا دوست تھا۔ اس نے کچھ سالوں بعد ۶۴ء میں نمرود بادشاہ کے دور کا ذکر کیا ہے جب روم میں آگ لگ جانے کے بعد عیسائیوں پر سخت ظلم و ستم ڈھایا گیا۔ مورخ کا کہنا ہے کہ نیرو بہانہ تلاش کر رہا تھا کہ کس طرح وہ اپنے آپ کو آگ لگانے کے الزام سے بچالے اور یہ الزام کسی اور کے ذمہ لگا دے۔ اور عیسائی وہ لوگ تھے جس سے لوگ سخت نفرت کرتے تھے۔ عیسائیت کے لفظ کا بانی ایک شخص کرسٹس (نصرانی) تھا جسے طبراس کے دور میں عدالت کے حاکم پلاطوس نے موت کی سزا سنائی تھی۔ ٹیسی ٹس کا اس قسم کا ذکر کرنا اس بات کا اشارہ دیتا ہے کہ یہ ایک واقعہ کا مختصر ذکر ہے جس کے بارے میں زیادہ تفصیل وہ پہلے دے چکا ہے۔ کیونکہ طبراس کے دور کی اولین تفصیلات کا ذکر موجود نہیں۔ عین ممکن ہے عیسائی راہبوں نے جو کچھ دیکھا اس کو وہ نہ چاہتے ہوں اور اسی لئے اس کو احاطہ تحریر میں نہ لائے۔

آخر Tacitus کی معلومات کا ماخذ کیا ہے؟ اور اس نے یہ معلومات کہاں سے حاصل کیں؟ Tacitus خود قدیم رومن پادریوں کے پندرہ افراد پر مشتمل بورڈ کا ممبر تھا جو سبالی پیشگوئیوں کو جاننے والے کاہن کے مشورے سے قربانی دیا کرتے تھے۔ یہ دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ یہ اس کے فرائض میں سے تھا کہ وہ دوسرے مذاہب کے بارے میں علم رکھے اور شاید اس نے اس سلسلہ میں کافی تحقیق بھی کی تھی اور بہت ممکن ہے رومن سینٹ کے پاس کردہ قوانین کے ریکارڈ میں پلاطوس کا تذکرہ موجود ہو جس کا اس نے ضرور مطالعہ کیا ہو گا۔

آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اعلیٰ عدالتی حاکم پلاطوس ایک معروف تاریخی شخصیت تھا۔ ہاں' بے شک ہمیں اس کے بارے میں جوزف اور فائلہ کی مرتب کردہ تاریخ میں ان کا حوالہ ملتا ہے۔ ہمیں پلاطوس کے بارے میں ایک کتبہ ملا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اس نے طبراس کے اعزاز میں قیصریا کے مقام پر ایک معبد تعمیر کرایا تھا جب وہ عدالت کا حاکم اعلیٰ تھا اور اس نے ایسے سکے بھی جاری کئے تھے جس سے یہودی ناراض ہوئے کیونکہ ان پر بت پرستوں کی قربانی کی بہت سی چیزوں کی علامات تھیں۔ یہ وہ الگ الگ

ٹکڑے ہیں جو آپ کو انجیل مقدس میں ملتے ہیں۔

لہٰذا جس دنیا کے متعلق انجیل مقدس میں تفصیلات بیان کی گئیں ہیں وہ حقیقت میں بھی موجود تھی۔

بالکل۔ ایک شخص جو خود عملی رنگ میں عیسائی نہیں لیکن بنیادی طور پر قدیم تاریخ کا مورخ ہے' کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مسیح ناصری ایک تاریخی شخصیت ہیں؟

ہاں بلاشبہ۔ اس سے انکار کرنا بے وقوفی ہو گی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہمارے پاس Tacitus ہیں۔ اور مثال کے طور پر اگر عیسائیت دوسری صدی میں سسک رہی تھی۔ تو پھر بھی ہمارے پاس اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ اس نام کا کوئی شخص طبراس کے دور میں جودیا میں رہتا تھا جس کو عدالت کے حاکم پلاطوس نے سزا کے طور پر یہاں بھیجا تھا اور لوگ جیساکہ Pliney بتاتا ہے اس کو بطور خدا عبادت کرتے تھے۔

جب ہم انجیل مقدس کے علاوہ پرانے زمانے کے شواہد کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ بنیادی خاکہ ملتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ناصرہ کے علاقہ گلیلی کے رہنے والے تھے اور جن کے پیروکاروں کو تمسخر سے نصرانی کہا جاتا تھا۔ آپ ایک استاد اور معالج تھے جو شدید اختلاف کا مرکز تھے۔ جن کو عدالت کے حاکم پیلاطوس کے حکم پر صلیب پر چڑھا دیا گیا جو کہ ۳۶ء کے زمانہ میں جو دیا میں متعین تھا اور جس کو پھر معزول کر دیا گیا تھا۔ آخرکار حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت ایک نئے مذہب کی بنیاد بنی۔ یہ بنیادی خاکہ یہودیوں' عیسائیوں اور بت پرستوں میں مشترک ہے اور اسی کو تاریخی حقیقت کے طور پر لیا جاسکتا ہے مگر اس ڈھانچہ پر مزید گوشت چڑھانے کے لئے ہمیں پروفیسر Burley کے بیان کردہ حقائق کی طرف جانا ہو گا۔

لہٰذا اس بات پر مزید تحقیق کے لئے کہ حضرت عیسیٰؑ کیا تھے؟ ہمیں عہدنامہ جدید اور خاص طور پر اناجیل کو دیکھنا ہو گا۔ اگر آپ اپنے شہر میں کتابوں کی کسی دکان میں جائیں تو وہاں آپ کو دکاندار شاید گڈ نیوز بائبل کے ۱۹۷۶ء کے ایڈیشن کی کاپی پیش کرے گا۔ ہم اس کا متی کا باب کھولتے ہیں اور یہاں پڑھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ Galilee کے صوبے ناصرہ (Nazareth) کے مقام سے آئے تھے۔ حضرت یوحناؑ نے دریائے اردن میں ان کو بپتسمہ دیا۔ اب ہمیں کس طرح علم ہو کہ جو کچھ مرقس نے لکھا وہ سب سچ ہے؟ کیونکہ یہ بائبل بھی تراجم کی ایک لمبی قطار میں سے ایک جدید ترجمہ ہے۔

اسی طریق پر چلتے ہوئے ہم حضرت عیسیٰؑ کے وقت سے ۱۸۸۱ء کے ترجمہ تک پہنچ جاتے ہیں' جب ۱۶۱۱ء کے مستند ترجمہ کی نئے شواہد کی روشنی میں تصحیح کی جاتی ہے۔ ترجمہ کو تیار کرنے والوں نے رابرٹ آئن شٹائن جیسے عالموں کے علم پر انحصار کیا جنہوں نے ۱۵۵۰ء میں پہلا لاطینی نسخہ تیار کیا جس پر کافی تنقیدی نظر ڈالی گئی تھی۔ ۱۵۲۶ء میں پہلی انجیل عہدنامہ جدید شائع ہوئی جس میں William Tindale نے لاطینی نسخہ کے متن پر انحصار کیا تھا جو اراسمس نے ۱۵۱۶ء میں شائع کی تھی۔ سب سے پہلی شائع ہونے والی بائبل Gutenburg بائبل تھی جو ۱۴۵۵ء کے قریب شائع ہوئی۔ اس کا متن لاطینی زبان میں گوتھک رسم الخط میں ہے۔ الفاظ کا ٹائپ سیاہ ہے اور اس میں سجاوٹ کے لئے ہاتھ سے گلکاری کی گئی ہے۔ بائبل کا یہ لاطینی ترجمہ ایک ہزار سال تک مسودہ کی شکل میں منتقل ہوتا گیا۔ کیونکہ اسے سینٹ جروم نے لکھا تھا۔ زمانہ وسطیٰ کی لاطینی انجیل اکثر خوبصورت اور قیمتی پارچوں پر لکھی جاتی تھی جن پر حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے واقعات کی تصاویر بنائی جاتی تھیں جو اس وقت مروج تھیں۔ لیکن جو بائبل یونانی زبان میں مرتب کی جاتی تھی آج کے عیسائی عالموں کے نزدیک ان مسودات کو جو ۳۰۰ء سے ۶۰۰ء کے درمیان لکھے گئے بڑی قدر و منزلت حاصل ہے۔ لہٰذا اب ہم مزید پیچھے کی طرف چلتے ہیں۔

انجیل قدیم زمانے کی کتب میں سب سے مستند کتاب ہے۔ لیکن ایک عبارت جس کو یکے بعد دیگرے کئی کاتب نقل کریں تو تدریجاً اس میں غلطیاں داخل ہو جاتی ہیں۔ متن کے نقاد اس امید سے مسودات کی جانچ پڑتال کرتے ہیں کہ غلطیوں کو تلاش کر کے ان کی تصحیح کر دی جائے۔

لیکن موجودہ صدی میں ایک دفعہ پھر کہانی کو مزید پیچھے لے جایا گیا ہے۔ پیپرس پر لکھے ہوئے عہد نامہ جدید کے تقریباً ۸۰ ٹکڑے مصر میں ملے ہیں۔ ان کا تعلق دوسری یا تیسری صدی عیسوی سے ہے کچھ تو کئی صفحات پر مشتمل ہیں لیکن کچھ چھوٹے چھوٹے پرزے ہیں۔ مانچسٹر میں پیپرس کے کاغذ پر تحریر کردہ عہد نامہ جدید کے حصے سب سے پرانے ہیں۔ بین الاقوامی اصطلاح میں ان کو P52 کہا جاتا ہے۔ یہ خاص یونانی طرز تحریر میں خوبصورت انداز پر لکھے گئے ہیں حتیٰ کہ ان میں سے کچھ حروف کو میں بھی پڑھ سکتا ہوں۔ طرز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۰۰ء اور ۱۵۰ء کے درمیان لکھی گئیں۔ لہٰذا یہ ہمارا سب سے قریبی جسمانی تعلق ان لوگوں کی تحریری شہادت سے ہوتا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کو جانتے تھے۔

اگر Rylands کی لائبریری میں موجود بائبل کے ٹکڑے ۱۲۰ء کے قریب تحریر کئے گئے ہوں تو پھر بھی تقریباً ۹۰ سال کا طویل وقفہ حضرت عیسیٰؑ کے صلیب دیئے جانے کے واقعہ تک پہنچنے میں آ جاتا ہے جو ۳۰ء میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ ہمارا پہلا قدم یوحنا کی انجیل کے اصلی ترجمہ کی طرف ہو گا جو اس کا حصہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کو قلمبند کرنے والوں کے ناموں سے اس سلسلہ میں کوئی مدد نہیں ملتی کیونکہ یہ اصلی کتاب کے متن کا حصہ نہیں کیونکہ ان کو بعد میں کلیسا کے رسم و رواج کے مطابق شامل کیا گیا۔ سینٹ یوحنا کی انجیل غالباً ۹۰ عیسوی میں ایک غیر معروف مصنف نے تحریر کی تھی۔ اسی طرح وہ بائبل جو ان کے نام سے منسوب ہے حقیقت میں ممکن نہیں کہ اسے متی کے کسی شاگرد نے تحریر کیا ہو۔ یہ تقریباً ۸۰ء کے زمانے میں مرتب کی گئی۔ یہ وہی وقت تھا جب لوقا کی انجیل بھی مرتب ہوئی۔

لیکن اگر یہ عینی شاہد نہیں تو متی اور لوقا نے یہ معلومات کہاں سے حاصل کیں؟ ان کی یہ دونوں اناجیل تقریباً یوحنا انجیل کی طرح' بہت زیادہ ترقی یافتہ اور پیچیدہ ہیں۔ اور ان میں بہت سی چیزیں مشترک بھی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات کے ماخذ بھی مشترک ہیں۔ ان میں سے ایک ماخذ جو ابھی تک موجود ہے ہمیں مزید ۲۰ سال پیچھے کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے اس انجیل کو استعمال کیا ہے جسے ہم مرقس کہتے ہیں جو ۶۵ عیسوی کے قریب لکھی گئی۔ لیکن متی اور لوقا دونوں زیادہ تر مواد خالص طور پر حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے بارے میں ایک دوسرے سے حاصل کرتے ہیں جو کہ مرقس میں موجود نہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ دونوں نے ایک تحریر شدہ اقوال کے مجموعہ سے استفادہ کیا جو Q کہلاتا ہے اور جسے ۵۰ عیسوی میں مرتب کیا گیا لیکن یہ مجموعہ گم ہو گیا ہے۔ تمام اناجیل کے درمیان تعلق کو دوبارہ جانچا جا رہا ہے لیکن تقریباً تمام علماء ان کی تاریخ ۵۰ اور ۱۰۰ عیسوی کے درمیان بتاتے ہیں اور ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان انجیلوں کا مواد اوائل کے کلیسا کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر ۲۰ سال یا اس سے زیادہ عرصہ کے درمیانی وقفہ کے دوران ترتیب دیا گیا یا جب انجیل کی زبانی روایات سینہ بہ سینہ چل رہی تھیں۔

لہٰذا ہمیں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کافی مواد انجیلوں سے ملتا ہے جو ان کی وفات کے بعد ایک یا دو نسل گزرنے کے بعد یونانی زبان میں لکھی گئیں۔ یہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ جو یہ کہہ رہے ہیں سچ ہے؟ خیر سب سے سیدھی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ تو مکمل طور پر سچ ہو نہیں سکتا کیونکہ یہ ایک دوسرے سے کافی زیادہ اختلاف کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو یہ آسمانی صحیفہ کی حیثیت نہیں رکھتی۔

مثال کے طور پر متی کے آخری دن کے عشائیہ کی تفصیل میں یہ شامل کیا گیا ہے "میرا وقت قریب ہے۔ میں سالانہ عید فسخ تمہارے گھر اپنے حواریوں کے ساتھ مناؤں گا" لیکن یوحنا آخری عشائیہ کے آخری دن کے بارے میں یوں لکھتا ہے "یہ یہودیوں کے عید فسخ کی تیاری کا دن تھا...... پلاطوس نے یہودیوں سے کہا' یہ ہے تمہارا بادشاہ۔" متی کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کو یہودیوں کے عید فسخ کے دن صلیب دی گئی لیکن یوحنا کا خیال ہے کہ یہ یہودیوں کی عید سے ایک دن پہلے کا واقعہ ہے۔ یقیناً ان میں سے کوئی ایک تو غلط ہو گا۔ اسی

طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جن میں اناجیل کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ ناممکن ہے کہ ان تمام باتوں کو لفظ بہ لفظ مان لیا جائے جس طرح کہ وہ بیان ہوئی ہیں۔ لہٰذا جہاں دو بیان ایک دوسرے سے اتفاق نہیں کرتے تو ہم یہ کس طرح فیصلہ کریں کہ کون سا بیان حقیقت کے زیادہ قریب ہے۔

یہ ایک فن ہے اور یہ فن سائنس نہیں ہے۔ یہ علمی تنقید کا فن ہے۔ ہمیں ان اصولوں کی ضرورت ہے جن سے ہم یہ فیصلہ کر سکیں کہ کون سا بیان یا تفصیل زیادہ قدیم اور ابتدائی زمانے کا ہے اور ان اصولوں میں سے پہلا اصول یہ ہے کہ جہاں دو بیان ایک دوسرے سے اتفاق نہ کریں تو جو زیادہ مشکل یا ناممکن ہو اس کو قبول کرنے میں ترجیح دی جائے۔

مرقس میں موجود اس کہانی کو لیں: "ایک شخص دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر پوچھنے لگا کہ اے نیک استاد' میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں۔ یسوع نے اس سے کہا تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا" (۱۸:۱۰)۔

اب متی کو لیں: "اور دیکھو ایک شخص نے پاس آکر اس سے کہا اے استاد میں کون سی نیکی کروں تاکہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں۔ اس نے اس سے کہا کہ تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے نیک تو ایک ہی ہے" (۱۷-۱۶:۱۹)۔ دونوں بیانات قریباً ملتے جلتے ہیں لیکن حضرت عیسیٰؑ کے پہلے جواب کے الفاظ کو دیکھیں۔ کیا انہوں نے یہ کہا "کہ تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے" یا یہ کہ "تم مجھ سے نیکی کے بابت کیوں پوچھتے ہو؟" شاید پہلا جواب زیادہ مشکل ہے۔ "تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے" کے الفاظ حضرت عیسیٰؑ کی زبان پر عیسائی مبشرین نے کبھی بھی ادا نہ کروائے ہوں گے کیونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو انتہائی نیک سمجھتے تھے جبکہ متی کے یہ الفاظ کہ "تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے۔" اس کی اپنی کوشش لگتی ہے جس میں اس نے ایک قول کو نرم کرنے کی کوشش کی ہے جو اس کے عقیدہ کے مطابق کلیسا کی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اس لئے شاید متی نے فیصلہ کیا ہو گا کہ وہ مشکل متن کو اس طرح تبدیل کرے کہ اس سے حضرت عیسیٰؑ کا مقصد واضح ہو سکے۔

اس قسم کے طرز استدلال اکثر الٹ طریق پر بھی استعمال کئے جاتے ہیں اور ان کہانیوں کو زیادہ قابل اعتبار سمجھا جاتا ہے جو اوائل کے کلیسا کی تعلیمات کے خلاف باتیں بیان کریں۔ مجموعی طور پر لوگ اپنے لئے مشکلات پیدا کرنا پسند نہیں کرتے۔ حضرت یحییٰؑ کے ذریعہ حضرت عیسیٰؑ کے بپتسمہ کے واقعہ کو ہی لیں۔ اوائل کے عیسائیوں کے لئے اس واقعہ نے مشکلات پیدا کیں کہ کیوں ایک بے گناہ یسوعؑ رضاکارانہ طور پر اپنے آپ کو گناہ سے توبہ کرنے کے لئے پیش کرے۔ لہٰذا متی جیسے انجیل لکھنے والوں نے حضرت عیسیٰؑ کے حضرت یحییٰؑ سے بپتسمہ لینے کی وضاحت کرنے کی ایک رنگ میں کوشش کی اور اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ واقعہ مستند ہو۔

لیکن اب ہم بائبل کے تنقید نگاروں کے اسلحہ خانہ کے ایک مضبوط ہتھیار کی طرف آتے ہیں جس کی وجہ سے بیشتر لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ انجیل کے تمام حصے واقعات کو تاریخی لحاظ سے قلمبند کرنے کی بجائے درحقیقت ایک آزادانہ مرتب شدہ مجموعہ ہے۔ اس بات کی بنیاد اس حیرتناک مشابہت پر ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے واقعات اور عہدنامہ قدیم کے واقعات اور مضامین میں دیکھی گئی ہے۔

مثال کے طور پر عہدنامہ قدیم میں ذکر ہے کہ ایلیا بیابان میں روزے رکھتے ہیں' ایک مردہ بچہ کو زندہ کر دیتے ہیں اور آسمان پر چلے جاتے ہیں۔ اب دیکھیں کہ آپ نے ان واقعات کو پہلے کہاں پڑھا۔ اس سلسلہ میں یہ حوالہ ملاحظہ فرمائیں:

"اور ...... ایک شخص آیا اور پہلے پھلوں کی روٹیاں یعنی جو کے بیس گیروے اور اناج کی ہری ہری بالیں مرد خدا کے پاس لایا۔ اس (الیشع) نے کہا ان لوگوں کو دیدے تاکہ وہ کھائیں۔ اس کے خادم نے کہا کیا میں اتنے ہی کو ۱۰۰ آدمیوں کے سامنے رکھ دوں؟ سو اس نے پھر کہا کہ لوگوں کو دیدے تاکہ وہ کھائیں کیونکہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ

وہ کھائیں گے اور اس میں سے کچھ چھوڑ بھی دیں گے۔ پس اس نے اسے ان کے آگے رکھا اور انہوں نے کھایا اور جیسا خداوند نے فرمایا تھا اس میں سے کچھ چھوڑ بھی دیا" (۲ سلاطین ۴:۴۲-۴۴)۔

عہد نامہ قدیم کا یہ واقعہ صاف طور پر انجیل مقدس کی ۵۰۰۰ افراد کو کھانا کھلانے والے واقعہ کا ہی ایک رنگ میں ذکر ہے لیکن عیسائی مبشرین اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے ایسی ساری پیشگوئیاں پوری کر دکھائیں۔ جیسے اتوار کے دن جب حضرت عیسیٰؑ یروشلم میں داخل ہوئے اور لوگوں نے ان کا استقبال ہاتھوں میں کھجور کی ٹہنیاں لے کر کیا۔ تو اس کو حضرت زکریاؑ کی پیشگوئی کا پورا ہونا سمجھا جاتا ہے۔ بائبل میں اس کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے: "اے بنت صیون تو نہایت شادمان ہو' اے دختر یروشلم خوب للکار کیونکہ دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے۔ وہ صادق ہے اور نجات اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ حلیم ہے اور گدھے پر بلکہ جوان گدھے پر سوار ہے" (زکریا ۹:۹)۔

بے شک مرقس اور لوقا کے برعکس متی نے اس پیشین گوئی کو لفظی رنگ میں لیا ہے اور اس نے حضرت عیسیٰؑ کو ایک گدھے بلکہ ایک جوان گدھے پر سواری کرتے ہوئے بتایا ہے جو ایک قسم کا جسمانی ورزش کا تماشہ لگتا ہے۔

اب اس طرح کے واقعات کے بارے میں کیا صورت حال ہے۔ جیک فینٹن جو درھم یونیورسٹی میں سینٹ چاڈز کالج کے پرنسپل ہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

میرے خیال میں اس بارے میں مختلف رائے ہو سکتی ہیں۔ ایک خیال یہ ہو سکتا ہے کہ سب کا شروع سے یہی مقصد ہو گا۔ لیکن اس سے بات بنتی نہیں۔ اس لئے کہ بعض پیشگوئیاں جو پوری ہوئیں اور جن کا ذکر انجیل میں ہے اس کا اطلاق صرف یونانی نسخوں پر ہوتا ہے نہ کہ اصل عبرانی نسخوں پر۔ دوسرا طریق یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت عیسیٰؑ سب جگہ گئے تاکہ عہد نامہ قدیم کی پیشگوئیاں پوری ہوں۔ مجھے اس بات کو ماننے میں سخت تامل ہے اور یہ بات انجیل کی بیشتر دوسری پیشگوئیوں کے بارے میں ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ کیونکہ یہ وہ واقعات ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کو خود پیش آئے۔ اس لئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے یہ ارادتاً کئے۔ میرے خیال میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کلیسا کا ایمان ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی ذات میں خدا کے یہ وعدے پورے ہوئے اور پھر اس نے ان واقعات کو اس رنگ میں بیان کیا اور عہد نامہ قدیم کی ایسی عبارتوں کو اس میں لے آئے جو مستقبل کے مسیح کے بارے میں بطور پیشگوئیاں کبھی بھی مقصود نہ تھیں۔

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے واقعات کے بارے میں کیا خیال ہے' کیا ہم تسلیم کرلیں کہ ان کو عہد نامہ قدیم سے اختراع کیا گیا ہے یا ان کی حیثیت تاریخی ہے؟ پیدائش کے متعلق واقعات صرف متی اور لوقا میں ملتے ہیں اور ان دونوں اناجیل نے مرقس سے استفادہ کیا لیکن مرقس میں پیدائش کے بارے میں کوئی واقعہ بیان نہیں کیا گیا۔ جب اس بات پر غور کیا جائے کہ کس طرح متی نے مرقس سے استفادہ کیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ کافی حد تک وہ ان تفصیلات میں کوئی اضافہ نہ کر سکا۔ لیکن شروع میں اور آخر میں اس نے کچھ اضافہ کیا ہے اور جن واقعات میں اس نے اضافہ کیا ہے' خاص طور پر شروع میں' وہ کافی زیادہ عہد نامہ قدیم کی مرہون منت ہے۔ اس لئے مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس کو اس طریق پر کیا گیا کہ یہ کہا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ نے ضرور یہ پیشگوئیاں پوری کی ہوں گی اور پھر اس نے عہد نامہ قدیم میں اس سے متعلقہ پیشگوئیوں کی عبارتوں کو مناسب مقامات میں شامل کر لیا جو پوری ہو سکتی تھیں۔

کیا آپ مجھے اس طرح کی کوئی مثال دے سکتے ہیں جس میں پیدائش کے واقعات کے بارے میں تفصیلات کو اس طریق پر عہد نامہ قدیم سے لے کر بنا لیا گیا ہو؟

ہاں۔ متی کے شروع کے دو ابواب میں تقریباً تمام مواد وہی ہے جس سے ملتا جلتا مواد عہد نامہ قدیم میں ہے۔ اس کے شروع میں نسب نامے ہیں ان کا زیادہ تر حصہ تواریخ کے ابواب سے لیا گیا ہے۔

پھر یہ فرشتوں کے بارے میں ذکر کرتا ہے اور یوسف نجار سے تعلق کا اظہار کرتا ہے اور یہاں جس پیشگوئی کو استعمال کیا گیا ہے وہ یسعیاہ کی پیشگوئی ہے لیکن اس کو لاطینی طرز کے حوالہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور اس طرح کنواری کے بطن سے پیدائش کے تصور نے جنم لیا۔

متی اس بارے میں یہ لکھتا ہے: "یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا وہ پورا ہو کہ دیکھو ایک کنواری حاملہ ہو گی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوایل رکھیں گے" (متی ۱:۲۲، ۲۳)۔

متی نے یسعیا نبی کا یہ اقتباس عہد نامہ قدیم کے یونانی ترجمہ سے لیا جس میں لاطینی لفظ Parthenos ہے جس کا ترجمہ یقینی طور پر کنواری ہے۔ مگر اگر متی اصل عبرانی عبارت کی طرف جاتے جو یسعیاہ نے لکھی تھی تو وہاں لفظ Elma ہے جس کا مطلب نوجوان لڑکی ہے۔ عبرانی میں کنواری کے لئے لفظ Bathula موجود ہے۔ لیکن یسعیاہ نے اسے استعمال نہ کیا۔ وہ بالکل ایک قدرتی طور پر پیدائش کی پیشگوئی کر رہے تھے۔ یسعیاہ کی اصل پیشگوئی میں کنواری کے بطن سے پیدائش کا کوئی تصور موجود نہیں۔ متی نے اس کو صرف مسلمہ ثبوت کے طور پر استعمال کیا ہے کیونکہ اس میں عبرانی سے لاطینی میں ترجمہ غلط کیا گیا۔ اب مزید یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا متی کا اس بات پر یقین تھا کہ عیسیٰؑ نے کنواری کے بطن سے جنم لیا اور پھر اس نے بطور ثبوت کسی مواد کی تلاش کی یا یہ کہ پورا تصور اس غلط ترجمہ کی وجہ سے پیدا ہوا۔

حقیقت میں یہ ممکن ہے کہ کرسمس یعنی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے پورے واقعہ کا تانا بانا عہد نامہ قدیم سے ہی بنا گیا ہو۔ اس سلسلہ میں چند حوالے ملاحظہ فرمائیں:

میکاہ نبی فرماتے ہیں: "لیکن اے بیت لحم افراتاہ۔ اگرچہ تو یہودہ کے ہزاروں میں شامل ہونے کے لئے چھوٹا ہے تو بھی تجھ میں سے ایک شخص نکلے گا اور میرے حضور اسرائیل کا حاکم ہو گا" (میکاہ ۵:۲)۔

گنتی میں درج ہے: "یعقوب میں سے ایک ستارہ نکلے گا اور اسرائیل میں سے ایک عصا اٹھے گا" (گنتی ۲۴:۱۷)

یسعیاہ میں یوں آتا ہے: "ایک کنواری حاملہ ہو گی اور بیٹا پیدا ہو گا اور وہ اس کا نام عمانوایل رکھے گی جس کا ترجمہ ہے: خدا ہمارے ساتھ ہے" (یسعیاہ ۷:۱۴، متی ۱:۲۳)۔

"اس لئے ہمارے لئے ایک لڑکا تولد ہوا اور ہم کو ایک بیٹا بخشا گیا" (یسعیاہ ۹:۶)۔

"بیل اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدھا اپنے صاحب کی چرنی کو" (ایضاً ۱:۳)۔

اسی میں ایک جگہ درج ہے: "قومیں تیری روشنی کی طرف آئیں گی اور سلاطین تیرے طلوع کی تجلی میں چلیں گے" (ایضاً ۶۰:۳)۔

زبور میں آتا ہے: "ترسیس کے اور جزیروں کے بادشاہ نذریں گذاریں گے سبا اور سیبا کے بادشاہ ہدیے لائیں گے بلکہ سب بادشاہ اس کے سرنگوں ہوں گے۔ کل قومیں اس کی مطیع ہوں گی" (زبور ۷۲:۱۰، ۱۱)۔

سموئیل نبی نے یہ بیان کیا: "وہ لڑکا سموئیل خداوند کے حضور بڑھتا گیا" (سموئیل ۲:۲۱)۔

"سموئیل جو لڑکا کتان کا افود پہنے ہوئے خداوند کے حضور خدمت کرتا تھا" (۱۸:۲)۔

"تو خداوند نے سموئیل کو پکارا۔ اس نے کہا میں حاضر ہوں" (۳:۴)۔

"اور سموئیل کی بات سب اسرائیلیوں کو پہنچی" (۴:۱)۔

لہٰذا یہ بات صاف ہو گئی کہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے تمام واقعات عہد نامہ قدیم کے متن سے جوڑ کر بنائے گئے ہیں۔ لیکن کیا ایسا کیا گیا تھا یا یہ کہ بنیادی طور پر یہ تاریخی واقعات پر مبنی ہیں۔ جان فیشن کا اس بارے میں حتمی خیال کیا ہے؟

تاریخ اور حقائق کی روشنی میں

تصور پاکستان کی تخلیق میں ووکنگ مسلم مشن کا کردار

چوہدری رحمت علی میں ولولہ انگیز اقدام کی چنگاری مشن ہاؤس کے ڈرائنگ روم میں پیدا ہوئی!

انگریزی سے ترجمہ: کیپٹن عبدالسلام خان

(اس مضمون کے مصنف' خواجہ صلاح الدین احمد صاحب' حضرت خواجہ کمال الدین صاحب مرحوم بانی ووکنگ مسلم مشن' انگلستان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ آپ اس زمانہ میں انگلستان میں طالب علم تھے جبکہ چوہدری رحمت علی صاحب بھی تعلیم کی غرض سے انگلستان کے ساحل تک پہنچے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ چوہدری رحمت علی جیسے روشن خیال اور پرجوش نوجوان علامہ اقبال کے آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۳۰ء کے اجلاس میں پیش کردہ مسلمانوں کے لئے الگ وطن کے تصور سے نئے جذبہ سے سرشار تھے۔ تاہم ابھی تک چوہدری صاحب موصوف اس تصور سے صرف ذہنی اور جذباتی حد تک متاثر تھے۔ تاوقتیکہ اس خیال نے ووکنگ مسلم مشن میں منعقدہ "سنڈے میٹنگ" میں (جس میں چوہدری رحمت علی صاحب' دوسرے مسلمان سٹوڈنٹس کی طرح شمولیت کیا کرتے تھے)۔ اتفاقاً ایک ٹھوس شکل اختیار نہ کرلی۔ مندرجہ ذیل مضمون میں خواجہ صلاح الدین احمد صاحب نے جو کہ انگلستان میں تصور پاکستان کو ایک ٹھوس شکل دینے اور رائے عامہ کو ہموار کرنے میں بذات خود شامل تھے' پاکستان کے معرض وجود میں آنے کی کہانی کی گمشدہ کڑیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے (جیساکہ وہ لکھتے ہیں) کہ جبکہ ابھی چوہدری رحمت علی صاحب کے اکثر ساتھی جنہوں نے ان سے تعاون ہیں زندہ نہیں اور جو اس کہانی کی تصدیق کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے' ریکارڈ کو درست کردینا ہے!---ایڈیٹر)

پچھلے اگست کے پاکستان ٹائمز کے یوم پاکستان کے ضمیمہ میں "ایک فراموش شدہ ہیرو" (A Forgotten Hero) کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں مصنف' مسٹر ایم انور نے چوہدری رحمت علی صاحب کے بارہ میں لکھتے ہوئے کچھ ایسے حقائق اور واقعات کا ذکر کیا جو کہ بلاشبہ آنے والی نسلوں کے لئے بہت سودمند ہوں گے جن کے نتیجہ میں پاکستان معرض وجود میں آیا اور یہ کہ حقائق کو اصلی اور وسیع تناظر میں پرکھا جاسکے۔ مصنف' مضمون کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے۔

"وہ (چوہدری رحمت علی) ووکنگ میں اس حالت میں دفن ہیں کہ ان کی قبر پر کتبہ تک نہیں لگا ہوا۔ پاکستان کا یہ بیٹا جس نے پاکستان کے لئے جلاوطنی میں جہاد کیا' جلاوطنی میں ہی مردہ پڑا ہے۔ ان کا حق بنتا تھا کہ انہیں سرزمین پاکستان میں باعزت گوشہ نصیب ہوتا۔ کیا ہم اس فراموش شدہ ہیرو کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے کوئی قدم اٹھائیں گے۔ کیا ہم ان کی یاد میں کوئی ایسی یادگار قائم کریں گے جو کہ پاکستان کی تاریخ میں ان کے مقام کے شایان شان ہو!"

ان لوگوں کے لئے جو تحریک پاکستان کے پس منظر سے واقف ہیں یہ بات کہ وہ ووکنگ میں مدفون ہیں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہ شاہجہان مسجد ووکنگ' انگلستان کا مقدس مقام ہی تھا جہاں پر پہلے پہل چوہدری رحمت علی صاحب کے دل میں تصور پاکستان کے لئے جذبہ جہاد اور مشنریوں والا جوش و خروش جاگا اور ان کے رگ وپے میں ایک خوابیدہ جذبہ شعلہ زن ہوا۔ حتیٰ کہ اس چنگاری سے بنے ہوئے شعلہ کی روشنی ان لوگوں تک جا پہنچی جو کہ اس تحریک کو اس کے انجام تک بہتر طریقہ سے پہنچاسکنے پر قدرت کی طرف سے مامور تھے۔ پس اگر قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ آخرکار ووکنگ میں ہی اپنی آخری آرام گاہ پائیں تو کم ازکم میں یہ محسوس

کرتا ہوں کہ یہ بات بھی معنی خیز ہے کیونکہ وہ تحریک جس کا مقصد پاکستان کا قیام تھا ووکنگ مسجد کے مقدس احاطہ میں ہی شروع ہوئی! وہ ہیرو جو اپنے مقصد کو پہنچ جائے اور اپنے مشن کو مکمل کر لے اسے کسی کتبہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان سے پہلے بھی کچھ لوگ تھے جن کے نقش قدم پر وہ چلے اور انہیں بھی کتبوں کی ضرورت نہیں۔ ان کے مشن کی کامیابی ہی ان کا صلہ ہے اور بحیثیت مجاہدین اسلام کے ان کی یادیں ہمیشہ تازہ و سرسبز رہیں گی اور ان کی زندگیاں آنے والوں کے لئے قابل تقلید نمونہ۔ اس لئے چوہدری رحمت علی صاحب کو ایک "فراموش شدہ ہیرو" نہیں کہا جا سکتا ان کا نام تاریخ پاکستان میں انمٹ حروف میں کندہ ہو چکا ہے۔

مسٹر انور علی کے مذکورہ بالا مضمون کی "پاکستان ٹائمز" میں اشاعت کے بعد "پاکستان ٹائمز" کے قارئین کے خطوط کے کالم میں کافی لے دے ہوئی۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ وہ لوگ جنہوں نے چوہدری رحمت علی صاحب کے ساتھ کام کیا تھا دیر ہوئی فوت ہو چکے ہیں مجھے ان باتوں کی اس وقت تردید کرنے کا خیال بھی آیا مگر تردید کرنے سے رکا رہا۔

تب سے بہت سے دوستوں کا جو کہ اصل حقائق سے واقف ہیں مگر اس شخص کی سی ثقاہت نہیں رکھتے جس نے کہ خود ان میٹنگز میں حصہ لیا ہو' اصرار ہے کہ اس زمانے کی ان تمام میٹنگز کا ریکارڈ مرتب کیا جائے اور ضروری ہے کہ یہ حقائق ان لوگوں کی زندگی میں ہی ریکارڈ ہو جائیں جو کہ ان میں سے کسی ایک بھی میٹنگ میں شریک تھے۔ میں نے ووکنگ مسلم مشن کے ساتھ ایک خصوصی تعلق کی وجہ سے ان تمام میٹنگز میں بطور ایک سرگرم رکن کے حصہ لیا جن کے نتیجہ میں آخر کار چوہدری رحمت علی صاحب نے اس مشن کو پورا کرنے کا مشکل بیڑا اٹھایا اور جس کے لئے قدرت نے انہیں پہلے ہی سے چن رکھا تھا۔ خوش قسمتی سے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم میں سے سات اب بھی زندہ ہیں۔ ہر کوئی اپنی اپنی فیلڈ میں خوب جما ہوا ہے۔ یہ سب لوگ واقعات کے تسلسل میں جو خلا آ گئے ہیں پر کر سکتے ہیں اور اس بات کا جواب بھی مہیا کر سکتے ہیں کہ چوہدری رحمت علی صاحب' علامہ اقبال جن کے ایک جوشیلے ہیرو تھے' نے اس تحریک کو کچھ عرصہ کیمبرج میں قیام کے بعد ۱۹۳۳ء میں ہی کیوں شروع کیا اور اس سے پہلے کیوں نہیں؟ خصوصاً جب وہ اس سے پہلے تو اپنے وطن میں ہی تھے؟

ووکنگ میں پہلی میٹنگ

یہ ۱۹۳۲ء کی گرمیوں کا ذکر ہے۔ شاید جون یا جولائی کا مہینہ ہو گا۔ کہ چوہدری رحمت علی صاحب جو کہ ان دنوں کیمبرج میں زیر تعلیم تھے۔ اتوار کے دن ووکنگ تشریف لائے۔ ووکنگ مشن میں اتوار کا دن برطانوی مسلمانوں اور دیگر ممالک سے آئے ہوئے مسلمان بھائیوں سے رابطہ پیدا کرنے کا بہترین موقع ہوتا تھا۔ ہمیشہ بعد دوپہر امام صاحب' شاہجہان مسجد میں لیکچر دیا کرتے تھے۔ نماز کے بعد سر سالار جنگ میموریل ہاؤس متصل ووکنگ مسجد میں مہمانوں کا قیام رہتا جہاں رات دیر تک مذہبی بحثیں جاری رہتی تھیں۔ ایسی ہی ایک اتوار کو چوہدری رحمت علی صاحب' مولانا عبدالمجید صاحب' امام مسجد کی خصوصی دعوت پر دن کے کھانے سے ذرا پہلے تشریف لائے تاکہ تمام دن ہمارے ساتھ گذار سکیں۔

چوہدری رحمت علی صاحب کی گفتگو کا صرف ایک ہی موضوع ہوا کرتا تھا۔ لنچ کے لئے ابھی وہ بیٹھے بھی نہ تھے کہ انہوں نے اس موضوع پر گفتگو شروع کر دی اور وہ تھا علامہ اقبال! ان کا واقعی علامہ کے ساتھ قریبی تعلق اور رابطہ رہا تھا اور ایک سچے پیرو کی طرح اس عظیم مفکر کے لئے ان کے دل میں انتہائی جذبہ عقیدت اور محبت موجزن تھا۔ اس عظیم شاعر کے متعلق مسحور کن گفتگو کے دوران انہوں نے علامہ کی اس دلی خواہش پر زور دینا شروع کیا کہ انڈیا میں جہاں مسلمانوں کی اکثریتی آبادی ہے مسلمانوں کے لئے اس خطہ کو ایک علیحدہ وطن ہونا چاہئے۔ چوہدری رحمت علی صاحب بار بار اس بات پر زور دیتے تھے کہ مسلمانان ہند کے مستقبل کا حل اسی پلان میں مضمر ہے۔

تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک کسی بھی مسلمان دانشور نے اس خواب کو عملی شکل دینے کے متعلق کوئی خاص غور و فکر نہ کیا تھا اور اس لئے اب تک یہ صرف ایک خیال اور گفتگو کے موضوع تک ہی محدود تھا اور خطرہ تھا کہ اتنی دیر تک ایک تخیل رہنے کی وجہ سے یہ محض

تخیلات کی زینت ہی نہ بن کر رہ جائے۔ ہم سب کو یہ ایک المیہ محسوس ہو رہا تھا کہ جس اہم موضوع پر ہندوستان کے ایک عظیم مسلمان مفکر نے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا تھا وہ اب تک صرف ڈرائنگ روم کی بحثوں تک ہی کیوں محدود تھا حالانکہ برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کا انحصار اس کی کامیابی یا ناکامی پر تھا۔

گفتگو کے اس مرحلہ پر امام مولانا عبدالمجید صاحب یوں گویا ہوئے:

"بھئی ہم لوگ صرف باتیں ہی کیوں کرتے ہیں اور عملی قدم کیوں نہیں اٹھاتے؟ اگر علامہ اقبال کے پاس اپنی قوم کے لئے کوئی پیغام تھا تو جہاں تک ان کا تعلق ہے انہوں نے قوم کو یہ پیغام پہنچا کر اپنا فرض ادا کر دیا ہے! اور اگر آپ یہ یقین رکھتے ہیں کہ صرف اسی پیغام میں مسئلہ کا حل موجود ہے تو آپ اس بارے میں کوئی عملی اقدام کیوں نہیں اٹھاتے!"

چوہدری رحمت علی صاحب کے اس استفسار پر کہ کیا کوئی عملی قدم اٹھایا جا سکتا ہے؟ مولانا عبدالمجید صاحب نے میرے والد حضرت خواجہ کمال الدین صاحب کی فوٹو کی طرف اشارہ کیا جو کہ ڈرائنگ روم کی دیوار پر لٹکی ہوئی تھی اور کہا:

"وہی کرو جو انہوں نے کیا! ان کے دماغ میں ایک خیال تھا جس پر وہ یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے دنیا کے ساٹھ کروڑ مسلمانوں کو افسوس بھری نگاہ سے دیکھا کہ وہ کس طرح ایک بے چین نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں اور مغربی اثرات کس طرح ان کے اندر سرایت کر گئے ہیں اور کس طرح وہ ایک شکست خوردہ ذہنیت میں ڈوبتے جا رہے ہیں اور اپنے شاندار ورثے کو نگاہ سے اوجھل ہونے دے رہے ہیں! چونکہ ان کا دل قرآن کریم کی اعلیٰ تعلیمات اور نبی کریم صلعم پر ایمان سے بھرپور تھا اس لئے انہوں نے عیسائیت کے مرکزی قلعہ پر اسلام کا جھنڈا لہرانے اور تثلیث کو اس کی اپنی زمین پر چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کو یقین تھا کہ اسلام کا ارفع پیغام مغرب سے بلند کرنا ہو گا! انہوں نے اس مرکز کو شروع کیا اور رسالہ "اسلامک ریویو" جاری کیا جو کہ تمام دنیا کے مسلمان دانشوروں کو وہ بھیجتے تھے!"

برطانوی سرزمین پر ووکنگ میں اسلام کا جھنڈا لہرانے' ایک آدمی کے خواب اور اس کے پر عزم کوششوں سے یہ معرکہ طے ہونے کی داستان کو جاری رکھتے ہوئے' مولانا عبدالمجید صاحب نے فرمایا:

"ایک دفعہ ایسی ہی ایک اتوار کے دن مولانا محمد علی جوہر اپنے کئی دوستوں کے ساتھ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب سے ملنے یہاں تشریف لائے۔ گفتگو کے دوران مولانا محمد علی جوہر یکایک اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے:

خواجہ! میں تمہاری لائبریری دیکھنا چاہتا ہوں! تمہارا "اسلامک ریویو" اسلامی دینیات سے اتنا لبریز ہوتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ضرور آپ کے پاس ایک وسیع لائبریری موجود ہو گی! مجھے اس لائبریری کو دیکھنے کا شوق ہے!

یہ سن کر حضرت خواجہ صاحب تو صرف مسکرا ہی سکتے تھے وہ ان کے ہمراہ ساتھ والے کمرہ میں گئے۔ مگر وہاں تو کوئی لائبریری نہ تھی مولانا نے پوچھا کہ لائبریری کدھر ہے؟ جواباً حضرت خواجہ صاحب نے شیلف سے قرآن کریم کا ایک نسخہ اٹھایا اور فرمایا: "یہ ہے میری لائبریری"۔

حضرت خواجہ صاحب بڑی تندہی سے کام کرتے تھے جیسا کہ کسان فصل بو رہا ہو اور جتنی تیزی سے ممکن تھا بوائی کرتے جاتے تھے تاکہ ان زمینوں پر جو کہ مذہب کے احیاء کے لئے تیار ہیں ان کے لگائے ہوئے پودے جڑ پکڑتے جائیں۔ بلاشک ان پودوں نے جڑیں پکڑیں۔ دنیا کے ہر خطہ کے لوگ جہاں کہیں وہ گئے ان کی تقریر سننے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے اور کھلے دل کے ساتھ ان کا استقبال کرتے تھے۔

تو تم ان کی مثال کی کیوں تقلید نہیں کرتے۔ اگر مسلمانان برصغیر کے لئے اس تخیل میں کوئی جان ہے' تو یہ پودا ضرور جڑ پکڑے گا....... ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاید آئندہ دس سال تک ایسا ہو"۔

اس تقریر کا چوہدری رحمت علی صاحب پر اثر دیکھا جا سکتا تھا۔ خاموشی سے وہ اپنے دل میں اس پر غور کرتے رہے! ان کے جذبات میں تموج پیدا ہوا۔ چند لمحوں بعد وہ بولے:

"لازماً کوئی ٹھوس قدم اٹھانا چاہئے!"

مگر اس کو عملی شکل دینے کے لئے اور اس کام میں پہل کرنے کی

خاطر انہیں ساتھی کارکنوں کی مدد درکار ہو گی۔ کام کا یہ حصہ امام صاحب کے بس کا نہ تھا اس لئے میں نے خود کو اس کام کے لئے رضاکارانہ طور پر پیش کیا۔ میں نے رائے دی کہ اگلے اتوار ووکنگ میں پھر ایک میٹنگ رکھی جائے اور وعدہ کیا کہ میں کچھ اور دوستوں کو بھی اس تقریب میں مدعو کروں گا۔

شیخ محمد جمیل (خلف الرشید خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب) اور خان محمد اسلام خٹک (خلف الرشید مرحوم خان بہادر قلی خان) دونوں آکسفورڈ میں ایم اے کے طالب علم تھے اور ۴ ہک روڈ سربیٹن (یہ قصبہ ووکنگ سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر تھا) میں اس زمانہ میں رہائش پذیر تھے۔ دونوں کے میرے ساتھ مشفقانہ مراسم تھے اور دونوں سے اس اہم مقصد کے لئے مدد اور پشت پناہی کرنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اس دن چوہدری رحمت علی صاحب کی رخصتی سے قبل ہی فون پر یہ طے ہو گیا کہ وہ دونوں بھی اگلے اتوار ووکنگ میں کھانے پر آئیں گے۔ اس دن جب چوہدری رحمت علی صاحب شام کی ٹرین سے ووکنگ سے واپس ہوئے تو وہ تخیل پاکستان کو ایک عملی شکل دینے کا عزم اور اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقف کرنے کا مصمم ارادہ ساتھ لے کر لوٹے۔

اسی اتوار کو ایک کشمیر کے رہنے والے پروفیسر بمعہ اپنی فیملی کے بھی اس مجلس میں موجود تھے گو مجھے ان کا نام یاد نہیں رہا۔ یہ ان کی مسجد میں پہلی آمد تھی۔ اس معاملہ میں ان کی دلچسپی اتنی گہری تھی کہ وہ اگلے اتوار بھی تشریف لائے اور پھر سربیٹن میں اگلی اور فائنل میٹنگ میں بھی۔

ووکنگ میں دوسری میٹنگ

اگلی میٹنگ جو اگلی اتوار کو ووکنگ مسجد میں منعقد ہوئی خاصی اہم تھی کیونکہ اب ہم اس تخیل کے صرف قابل عمل بنانے پر غور کرنے کے لئے ہی نہیں بلکہ اسے ایک فوری ٹھوس عملی شکل دینے کے لئے اکٹھے ہوئے تھے۔ اس دوسری میٹنگ میں جو لوگ شریک ہوئے ان میں مولانا عبدالمجید صاحب، چوہدری رحمت علی صاحب، ایک اور شخص جو کہ بعد میں بھی چوہدری صاحب کے اس مشن میں شریک کار رہے اور جن کا نام یاد نہیں، شیخ محمد جمیل صاحب، خان محمد اسلم خٹک صاحب، کشمیر کے رہنے والے پروفیسر صاحب اور خاکسار شامل تھے۔

شیخ محمد جمیل صاحب اور محمد اسلم خٹک صاحب دونوں بہت خوش تھے کہ اس تحریک کو آگے بڑھانے میں کام کی ابتدا ہو رہی ہے اور اپنا مکمل تعاون دینے کے لئے تیار تھے۔ تاہم انہوں نے نشان دہی کی کہ انگلستان میں موجود مسلمان طلباء کسی بھی قومی مفاد کے مسئلہ کے لئے جذبہ اور مالی قربانی کے لئے تیار تو ہوتے ہیں۔ مگر پردیس میں ہونے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ وہ تمام ملک میں منتشر ہیں بلکہ سوائے اپنی تعلیم کے اور کسی چیز کے لئے ان کے پاس نہ وقت ہوتا ہے اور نہ ہی وسائل۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اس تحریک کے بیڑے کو پار لگانے کے لئے تمام بوجھ چوہدری رحمت علی صاحب کو خود ہی اٹھانا پڑے گا۔

اس میٹنگ میں مندرجہ ذیل فیصلے ہوئے:

(۱) کہ تحریک چوہدری رحمت علی کیمبرج سے شروع کریں۔

(۲) کہ وہ ایک ماہانہ پمفلٹ شائع کرنا شروع کریں تاکہ ہر جگہ جہاں ممکن ہو اس تحریک کی پبلسٹی اور پروجیکشن ہو سکے۔ میں نے حاضرین جلسہ کو ووکنگ مسلم مشن گزٹ کی ایک کاپی دکھائی جس میں سرورق پر ہی دنیا کا نقشہ تھا اور ووکنگ کا مقام اس نقشہ پر ایک مینار سے آراستہ کیا گیا تھا اور میں نے تجویز دی کہ اس پمفلٹ پر اسی طرح ایک انڈیا کا نقشہ سفید رنگ میں ہونا چاہئے۔ وہ علاقے جو مسلمانوں کے لئے علیحدہ کئے جائیں سبز رنگ میں ہوں۔ گویا یہ سرورق کا نقشہ بذات خود بولے گا اور اس طرح ہمارا پیغام براہ راست پہنچائے گا۔

(۳) اس بات پر بھی اتفاق رائے ہوا کہ میں "اسلامک ریویو" کے خریداروں کی فہرست چوہدری صاحب کو مہیا کروں گا اور جن میں سے اکثریت چونکہ مسلمان دانشوروں کی ہے جو کہ تمام برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں اس لئے یہ لوگ پمفلٹ کی ترسیل کے لئے نہایت موزوں رہیں گے۔

(۴) کہ ان پمفلٹس کی کثیر تعداد ووکنگ میں عیدین اور عید میلادالنبی صلعم کی تقریبوں پر تقسیم کے لئے تیار رہنی چاہئے۔

(۵) یہ بھی متفقہ فیصلہ ہوا کہ میں چوہدری صاحب کو انگلستان میں ان

مسلمانوں کی فہرست مہیا کروں گا جن کے نام وو کنگ میں تقریبات میں مدعو کرنے کے لئے دفتر میں محفوظ رکھے جاتے ہیں۔

میٹنگ رات دیر گئے تک جاری رہی اور بعض شرکاء نے تو گھر واپسی کی آخری ٹرین پکڑی۔ اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ایک تیسری میٹنگ بلائی جائے جس میں

(۱) مسلمان علاقوں پر مبنی خطہ کا نام سوچا جائے۔

(۲) اس تحریک کو ایک رسمی اور باقاعدہ شکل دی جائے۔

(۳) کیونکہ اب یہ معاملہ ایک سیاسی مسئلہ بن چکا ہے اور ایک سیاسی جماعت کی سٹیج پر پہنچ گیا ہے اس لئے اب اگلی میٹنگ ۴۔ ہک روڈ' سربیٹن میں ہونی چاہئے جہاں شیخ محمد جمیل صاحب اور۔ اسلم خٹک صاحب میزبان ہوں گے۔

سربیٹن میں منعقدہ تیسری میٹنگ

اس تیسری میٹنگ میں گذشتہ میٹنگز میں شریک ہونے والوں میں سے سوائے مولانا عبدالمجید صاحب کے سب نے شرکت کی اور ان کے علاوہ خواجہ عبدالرحیم صاحب بارایٹ لاء اور عنایت اللہ صاحب نے بھی شرکت کی۔

اس میٹنگ میں چوہدری رحمت علی صاحب کو رسمی طور پر تحریک کا کام تفویض کیا گیا۔ یہ میٹنگ اس لئے اہم ہے کہ لمبی بحث کے بعد خواجہ عبدالرحیم صاحب نے اس خطے کا نام "پاکستان" تجویز کیا۔ یہ نام تمام شرکاء نے فوراً ہی متفقہ طور پر منظور کر لیا (بجائے دیگر مجوزہ ناموں مثلاً اسلام آباد و مسلم آباد وغیرہ کے!)

یہ نام اس لئے نہیں چنا گیا کہ اس نام میں پاکستان پر مشتمل علاقوں کے پہلے حروف پائے جاتے تھے بلکہ لفظ "پاک" بمعنی پاکیزگی کی وجہ سے پسند کیا گیا اور یہ کہ خدا کے حضور حاضر ہونے سے پہلے پاکیزگی لازمی ہوتی ہے۔ اسلام میں لفظ "پاک" کا مفہوم اعلیٰ ترین صفائی کا ہے۔ یہ وہ پاکیزگی ہے جو انسان کو ناپاکیزگی سے ممیز کرتی ہے اور ہندوؤں کے چھوت چھات کے جنون سے ہٹ کر ایک اعلیٰ اور ارفع تصور ہے! "پاکستان" کا نام گویا پاکیزگی اور طہارت کا دعوت نامہ ہے۔ ایسی جگہ جہاں مسلمان خدا کے سامنے تمام پاکیزگی اور انکساری کے ساتھ حاضر ہو سکیں گے اور اگر خدا تعالیٰ نے انہیں یہ خطہ بطور انعام عطا کیا تو وہ پوری کوشش کریں گے کہ دین اسلام پر عمل پیرا ہوں!

اسی بات پر میٹنگ اختتام کو پہنچی!

بعد کا تمام بوجھ' تمام کام اور تمام کامیابی چوہدری رحمت علی صاحب کا کارنامہ تھا۔ جہاں کہیں بھی ان پمفلٹوں کو بھیجنا ضروری ہوتا وہ بھیجتے تھے جہاں کہیں ان کو بانٹنا لازمی ہوتا وہ خود بمعہ اپنے معاونین اور دوستوں کے بانٹنے کے لئے موجود ہوتے۔ وہ نہ جانتے تھے کہ یوحنا بپتسمہ والے کی طرح وہ کسی دوسرے آنے والے کے پیش خیمہ تھے جو بالآخر اپنی تمام شان و شوکت میں آیا۔ پاکستان کا پرچم اٹھایا اور اسے اس سرزمین میں گاڑ دیا جس کا اس نے اپنے اعلان میں "پاکستان" کے طور پر مطالبہ کیا تھا اور وہاں کامیابی حاصل کی جہاں دوسرے ناکام ہو گئے تھے اور قوم کو اتحاد' استحکام اور ایمان دیا اور قوم کو ایک وطن لے دیا جسے وہ اپنا "پاک وطن" پکار سکیں۔ (ماخوذ از ہفتہ وار اخبار' دی لائٹ' لاہور ۱۶ جنوری ۱۹۶۶ء)

انگریزی سے ترجمہ: فائزہ عزیز' بی اے

سرینگر میں جماعت احمدیہ لاہور کا قیام۔۱

از محترم ڈاکٹر خورشید عالم ترین

۱۹۲۸ء کی بہار کا موسم تھا۔ مشہور عالم' حسن بیان اور بانی ووکنگ مسلم مشن' انگلستان حضرت الحاج خواجہ کمال الدین سرینگر تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ الحاج لارڈ ہیڈلے الفاروق تھے۔ جن کو انگلستان میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا اور اس وفد کے تیسرے فرد سر عباس علی بیگ تھے جو انڈین پریوی کونسل کے ممبر تھے اور جنہوں نے شاہجہان مسلم ووکنگ کے حاصل کرنے میں حضرت خواجہ صاحب کی بھرپور مدد کی تھی۔ مسلمانوں نے اس نہایت معزز وفد کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان جلسہ عام منعقد کیا جس میں سرینگر کی تمام مشہور شخصیات اور اعلیٰ عہدیداران نے شرکت کی۔ ریاست جموں و کشمیر کے مفتی اعظم مولانا محمد رشیدالدین مرحوم بھی اس جلسہ میں موجود تھے۔ ذیل میں اس تاریخی جلسہ کے بارے میں ان کی قلم سے روئیداد ملاحظہ فرمائیں:

انجمن ہمدرد اسلام اور انجمن اشاعت اسلام نے مل کر حضوری باغ کے وسیع میدان میں ایک جلسہ عام منعقد کرانے کا انتظام کیا۔ خواجہ سلام شاہ نقشبندی اور مذکورہ دونوں انجمنوں کے اراکین نے اس بڑے اجتماع کے لئے شاندار انتظامات کئے تھے۔ لوگوں کی بڑی تعداد اور مشہور علماء نے اس جلسہ میں شرکت کی۔ معزز ہندوؤں اور وکلاء نے بھی اس میں حصہ لیا۔ متعدد معروف شخصیات نے اس موقع پر تقاریر کیں۔ لیکن الحاج حضرت خواجہ کمال الدین صاحب کی تقریر سحر انگیز تھی اور سب پر حاوی رہی۔ (اردو رسالہ "اشاعت الحق" سرینگر' جلد ۱' نمبر ۱' ص ۲۲)

یہ پہلا موقع تھا کہ تحریک احمدیت لاہور کو کشمیری مسلمانوں سے موثر اور عملی تعارف کرایا گیا۔ دو سال بعد احمدیوں نے اردو بازار سرینگر کے وسیع میونسپل پارک میں عید میلادالنبی کے سلسلہ میں جلسہ عام منعقد کیا۔ یہ ایک لحاظ سے ریاست جموں و کشمیر میں میلاد کا پہلا جلسہ عام تھا۔ سرینگر کے بڑے رئیس خواجہ غلام محی الدین گنگو نے صدارت کی اور ریاست کے عظیم مفتی مولانا رشیدالدین صاحب نے سٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیں۔

کئی معزز مسلمان علماء نے تقاریر کیں۔ اس موقع پر ایک معزز ہندو سکالر پروفیسر سری کانتھ توخشانی نے بڑی پرجوش تقریر کی جس کی سب نے تعریف کی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کچھ ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کے سٹیج سے بولنے کی اجازت دی گئی تھی۔

الحاج حضرت خواجہ کمال الدین صاحب کی آمد سے بہت پہلے موجودہ صدی کے پہلے عشرہ میں دو کشمیری احمدی قادیان میں ادبی اور مذہبی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے آبائی وطن واپس آ گئے۔ ان کے نام مولوی محمد عبداللہ وکیل اور مولوی نورالدین قاری صاحب تھے۔ اس طرح وہ کشمیر میں "تحریک احمدیت" کے اصلی بانی تھے۔ اپنی واپسی کے بعد انہوں نے درس قرآن شروع کیا جو کہ ریاست جموں و کشمیر میں اپنی طرز کا پہلا درس قرآن تھا۔ ابتدائی ردعمل بے اعتنائی اور سرد مہری تھی لیکن جلد ہی پڑھے لکھے لوگ اور حکمران طبقہ اس درس قرآن کی طرف راغب ہوئے۔ "درس" پہلے محلہ اروات میں شروع ہوا۔ اور پھر محلہ ملک انگان' فتح کا دل' سرینگر میں منتقل ہو گیا۔ جب حاضرین کی تعداد بڑھ گئی تو لوگ ملک انگاں کے چھوٹے سے کمرے

ئیں نہ سما سکتے تھے۔ چنانچہ اس کو مولوی محمد عبداللہ وکیل کے بڑے ڈرائنگ روم واقع قلمدان پورہ' سرینگر میں منتقل کر دیا گیا۔ اس درس قرآن کی وجہ سے کشمیری نوجوانوں کا ایک پڑھا لکھا اور معقول گروہ "تحریک احمدیت" لاہوری گروپ میں شامل ہو گیا۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔

الحاج عبدالصمد صاحب' الحاج عبداللہ خان صاحب' ترین الیاس کھنڈے خان ترین (میونسپل انجینئر)' ماسٹر محمد عبداللہ والد معروف ڈاکٹر طاہرہ خانم اور پروفیسر زہرہ خانم' پرنسپل غلام محی الدین چو صاحب' جناب غلام نبی شورہ صاحب' جناب غلام نبی گلکار (مشہور کشمیری رہنما)' جناب محمد مقبول حقاق صاحب' جناب عبدالکبیر ملک صاحب' جناب محمد عبداللہ صاحب (جاگیردار' ہاری پورہ)' جناب سید نظام الدین صاحب (ٹیلیگراف ماسٹر)' منشی غلام رسول صاحب' جناب غلام محمد بھٹ صاحب (ڈپٹی ڈائریکٹر حفاظت غلہ جات)' پیر حفیظ اللہ چو وغیرہ۔ یہ سب احباب ملک عدم کو روانہ ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

تیسری دہائی کے شروع میں اس زمانے کے ایک اور عظیم مسلمان مبلغ نے ہمارے علاقے کا دورہ کیا۔ یہ جناب الحاج مولانا صدرالدین صاحب تھے۔ احمدیوں نے ان کے اعزاز میں ایک مرتبہ پھر اسی حضوری باغ کے کھلے احاطہ میں ایک جلسہ عام منعقد کیا۔ ہزاروں کی تعداد میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے شرکت کی۔

ہمارے عظیم حضرت مولانا صاحب کی عالمانہ تقریر نے ہندوؤں کے دل موہ لئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ وہ حضرت محمدؐ کی زندگی اور تعلیمات پر مزید لیکچر دیں۔ حضرت مولانا نے ان کی درخواست بخوشی قبول کی۔ ایک دہائی کے بعد حضرت مولانا صدرالدین صاحب کے اعزاز میں دوبارہ ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا۔ یہ جلسہ سرینگر کے کھلے گول باغ میں منعقد ہوا۔ دنیا کے مشہور ماہر تعلیم جناب غلام سیدین صاحب نے جلسہ کی صدارت کی۔ اس جلسہ کی تفصیلی رپورٹ اخبار "پیغام صلح" میں شائع ہوئی تھی۔

اسی اثناء میں آریہ سماج کے مبلغوں کا ایک بڑا گروہ سرینگر آیا اور اسلام اور مقدس نبیؐ پر کیچڑ اچھالنا شروع کیا۔ آریہ سماج کے اس شدید حملہ کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور سے مدد کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ حضرت مولانا عبدالحق ودیارتھی صاحب جو سنسکرت کے مشہور عالم تھے کو سرینگر بھیجا گیا۔ تھوڑے عرصے میں حضرت مولانا نے آریہ سماج کے اس اسلام دشمن گروہ کو شکست دی۔ اس کے بعد آریہ سماج کو اسلام اور مقدس بانی اسلام حضرت محمد صلعم پر کبھی کیچڑ اچھالنے کی جرات نہ ہوئی۔

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام (لاہور) کے سرینگر میں موجود ہونے کے باوجود اس کی اپنی کوئی مسجد نہ تھی۔ ان کا دفتر محلہ شہید گنج میں ایک کرائے کے کمرے میں تھا اور یہی کمرہ اجتماعی نمازوں کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ روپے اور ذرائع کی کمی کی وجہ سے سرینگر جماعت اپنی مسجد بنانے کی پوزیشن میں نہیں تھی اور لاہور مرکز بھی اتنا امیر نہیں تھا کہ وہ اس کام میں کشمیری احمدیوں کی مدد کر سکتا۔ لیکن سرینگر جماعت کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ اپنا ایک مضبوط اشاعتی مرکز قائم کریں۔ یہ دیرینہ خواہش بالآخر ایک تاریخی گشتی مراسلے کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

ا ذوالحجہ ۱۳۳۵ھ' ۱۳ فروری ۱۹۳۷ء

معزز اراکین جماعت

اسلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ۔

آپ بہتر جانتے ہیں کہ مسجد کے نہ ہونے کی وجہ سے جماعت کی سرگرمیوں میں روک واقعہ ہوا ہے اور کچھ حد تک جماعت کی ترقی سست پڑ گئی ہے۔ جماعت کی صحت اور ترقی اور تنظیم کے لئے مسجد کی موجودگی نہ صرف ضروری ہے بلکہ ناگزیر ہے۔ زیر دستخطی نے "مسجد فنڈ" کے نام سے بینک میں اکاؤنٹ کھولا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ آپ سب اس نیک کام میں گرم جوشی سے حصہ لیں گے اور خدا کی

رحمت سے فیض یاب ہوں گے۔

شیخ عبدالصمد

سیکرٹری' احمدیہ انجمن اشاعت اسلام' لاہور (سرینگر شاخ)۔

میرے پاس موجود تاریخی ریکارڈ بتاتا ہے کہ صرف ۴۵ افراد نے اس اپیل کا مثبت جواب دیا۔ شاید اس وقت سرینگر جماعت کی کل تعداد ہی اتنی تھی۔ ۴۵ افراد کا یہ پرجوش گروہ اتنے فنڈز اکٹھے کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ قلمدان پورہ' سرینگر میں ایک زمین کا ٹکڑا خرید کر اس جگہ پر ایک شاندار مسجد تعمیر کرنے کے عظیم کام کو شروع کر دیا گیا۔ الحاج کھنڈے خان ترین صاحب ہمیشہ ایسے معاملات میں ہماری رہنمائی کرتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف تعمیر کے کام کی نگرانی رضاکارانہ کی بلکہ اس عظیم الشان مسجد کے ڈیزائنر بھی وہی تھے۔ اس مسجد کی تعمیر شمالی افریقہ کے فن تعمیر کے طرز پر کی گئی۔

تعمیر کا کام شروع کرنے سے پہلے یہ سوچا گیا کہ حضرت امیر مولانا محمد علی صاحب سے اس کو شروع کرنے کی اجازت لی جائے۔ جو خط اس سلسلہ میں لکھا گیا ہے اس کے متن کا علم نہیں۔ لیکن اس کا جوابی خط ہمارے پاس محفوظ ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

مسلم ٹاؤن' اچھرہ' لاہور

۲۸-۱-۱۹۴۱

محترم بھائی شیخ صاحب

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ

آپ کا خط (نمبر ۴۰) اس ماہ کی ۱۳ تاریخ کو وصول ہوا۔ حضرت امیر نے متن کا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ کو یہ پیغام دوں کہ وہ ۱۵ اپریل سے پہلے سرینگر آئیں گے۔ مہربانی کر کے اس وقت تک مسجد کے تمام انتظامات تیار رکھیں۔ وہ مسجد کا سنگ بنیاد رکھ کر خوش ہوں گے۔"

میرے پاس حضرت امیر مولانا محمد علی صاحب کا خط بھی موجود ہے جو انہوں نے الحاج شیخ عبدالصمد کو براہ راست لکھا تھا۔

مسلم ٹاؤن' اچھرہ' لاہور

۱۲-۵-۱۹۴۱

محترم بھائی

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ

میری مصروفیات نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں مسجد کی تعمیر کے اصل صورت حال کے بارے میں معلوم کروں کہ کیا عمارت کا نقشہ منظور ہو گیا ہے اور کیا مسجد کی بنیادیں کھودنے میں کوئی رکاوٹ تو نہیں ہے۔

میں نے آپ کے خطوط سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ مجھے مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے دعوت دے رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کیا آپ نے باقی تمام انتظامات کر لئے ہیں۔ کیا آپ کے پاس اخراجات کے لئے کافی پیسہ ہے اور کیا مسجد کی تعمیر کے لئے حکام نے منظوری دے دی ہے۔ اگر یہ تمام مراحل طے ہو گئے ہیں تو پھر تو سنگ بنیاد رکھا جا سکتا ہے۔ اگر اس معاملے میں کوئی رکاوٹ ہے تو میں کام پورا کئے بغیر واپس آنا پسند نہیں کروں گا۔ ابھی حال ہی میں مجھے کچھ مشکلات کا سامنا ہے۔ میں اپریل میں آنے کے لئے تیار تھا لیکن جموں کے لوگوں نے میرے اس منصوبہ کو پسند نہیں کیا۔ میں ڈلہوزی کے لئے نکل جاؤں گا کیونکہ یہاں اپریل کے اختتام میں ناقابل برداشت گرمی ہو جاتی ہے۔ میری ڈلہوزی کے لئے تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں لیکن دو یا تین دنوں سے موسم میں اچانک تبدیلی آئی ہے جس کی وجہ سے میں ابھی تک یہاں ہوں۔

اگر آپ کو یہ مناسب لگے تو میں اگست کے مہینے میں آ جاؤں گا۔ کیونکہ یہ میرے لئے بہت آسان ہو گا۔ یا ستمبر کے شروع میں کیونکہ ستمبر کی ۲۰ تاریخ سے رمضان شروع ہو رہا ہے۔ اس لئے اگر آپ کی تعمیر کے کام میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو کیا ایسا ممکن نہیں ہو سکتا کہ میں اگست کے آخر میں یا ستمبر کے شروع میں آ جاؤں۔

سنگ بنیاد رکھنا یا بعد میں عمارت کا افتتاح ایک ہی طرح ہے۔

بہرحال آپ جو بھی مناسب سمجھیں مجھے اس کی اطلاع دیں۔ اگر کوئی شدید نقصان نہیں ہے تو کیا میں سفر کو اگست تک ملتوی کر دوں؟ مہربانی کر کے اپنا جواب جلد از جلد روانہ کریں۔

والسلام

آپ کا

محمد علی

اس خط سے ایک چیز بالکل واضح ہے کہ اس وقت تک سارے انتظامات کے لئے پیسہ سرینگر جماعت نے دیا تھا۔ اس بارے میں جو خط و کتابت ہوئی اس کا میرے پاس کوئی تاریخی ریکارڈ موجود نہیں۔ حضرت امیر یہاں جون ۱۹۴۱ء میں پہنچے ان کی آمد اور سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب کا تفصیلی بیان محمد علی بی اے نے دیا ہے جو ان واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔ ان کا مقالہ ہمارے ماہوار اردو رسالہ "اشاعت الحق" میں شائع ہوا تھا۔ اس رپورٹ سے کچھ اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

"جون ۱۹۴۱ء میں حضرت امیر مولانا محمد علی صاحب کار کے ذریعے ڈلہوزی سے سرینگر آئے۔ ان کی بیگم صاحبہ ان کے ساتھ تھیں اور وہ بنی ہاس کارٹ روڈ کے رستہ سے تشریف لائے۔ ان کے قیام کے انتظامات جناب ملک شیر محمد خان، بی اے کے گھر پر کئے گئے تھے جو کہ جماعت کے بڑے سرگرم اور ممتاز ممبر تھے اور ریاست کے مالیہ امور کے سیکرٹری تھے۔ اراکین جماعت اپنے پیارے حضرت امیر کے پرجوش استقبال کے لئے پہلے ہی سے جمع ہو گئے تھے۔ حضرت دن ڈھلنے کے وقت سرینگر پہنچے۔ استقبال کے لئے موجود احباب حضرت مولانا محمد علی صاحب کے مسکراتے ہوئے نورانی چہرے سے بہت متاثر ہوئے اس کے بعد نماز مغرب اور عشاء اکٹھی پڑھی گئیں۔ حضرت امیر نے نماز کی امامت کرائی اس کے بعد اراکین نے اپنے امیر سے اجازت چاہی اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جب حضرت مولانا کی آمد کی اطلاع سرینگر کے پڑھے لکھے اور روشن خیال لوگوں تک پہنچی تو انہوں نے ملک صاحب کے گھر کا رخ کیا اور اب ان کا گھر ہر وقت ہجوم سے پر رہنے لگا۔ ان تعلیم یافتہ اور روشن خیال احباب کی بار بار درخواست پر حضرت امیر جلسہ عام میں تقریر کرنے کے لئے تیار ہو گئے جو کہ گول باغ کے وسیع احاطہ میں منعقد ہوا۔ ہزاروں کی تعداد میں دستی اور بڑے اشتہار تیار کئے گئے۔ سرینگر کے تمام معززین کو خاص دعوت نامے ارسال کئے گئے۔ خوش قسمتی سے برصغیر کی مشہور شخصیات اس وقت سرینگر میں موجود تھیں۔ چنانچہ ان میں سے سر شیخ عبدالقادر صاحب کو اس موقع پر صدارت کے لئے منتخب کیا گیا۔

حضرت امیر نے "نیا نظام عالم" کے موضوع پر ایک نہایت خیال انگیز تقریر فرمائی۔ انسانوں کا ایک جم غفیر تھا اور وہ سب بڑے تحمل کے ساتھ حضرت مولانا کی تقریر کو سن رہے تھے۔ اس جلسہ عام کے کامیاب اختتام کے بعد حضرت امیر بیگم ظفر علی (انسپکٹریس آف سکولز) کو ملنے ان کے گھر گئے جنہوں نے حضرت مولانا کے اعزاز میں ایک بہت بڑا عشائیہ دیا۔ جمعہ کی نماز شہید گنج میں ایک بڑے خیمہ کے نیچے پڑھی جاتی تھی۔ حضرت امیر نے خطبہ جمعہ اور نماز پڑھائی۔ سنگ بنیاد کی تقریب اذان سے شروع ہوئی۔ اس جگہ پر لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ غیر احمدی مسلمانوں کی تعداد احمدی لوگوں سے بھی زیادہ تھی۔ حضرت امیر نے اپنے ہاتھوں سے سنگ بنیاد کی اینٹ رکھی اور پھر ایک مختصر تقریر کی جس میں آپ نے اس بات کی بڑے خوبصورت انداز میں وضاحت کی کہ خدا تعالیٰ کی واحدت کے ذکر کے ساتھ رسول اکرم صلعم کی رسالت اور خاتم النبین ہونے کا اعلان لازم و ملزوم ہیں۔

ہمارے درمیان آٹھ یا دس دن گذارنے کے بعد اور مختلف احباب کو اپنی میزبانی کا شرف دینے کے بعد حضرت امیر ڈلہوزی کے لئے روانہ ہو گئے۔ (اشاعت الحق، نومبر ۱۹۷۶ء)